ڈوگری افسانے

بزبانِ اُردو

ایک اِنتخاب

مؤلفہ

وِشوا ناتھ کھجوریہ

جے۔آر۔ ہرکشن لال چوپڑہ اینڈ برادر
پبلشرز اینڈ بک سیلرز پکّہ ڈنگہ جموں (جموں و کشمیر)

12-01-1967

ڈوگری افسانے

(ایک انتخاب)

پبلشرز:- جے۔آر ہرکشن لال چوپڑہ اینڈ برادرز
پکّہ ڈنگہ۔ جموں۔

پرنٹرز:- شاردا پرنٹنگ پریس۔ جوگی گیٹ۔ جموں

زمانہ اشاعت:- جنوری ۱۹۶۷ء

قیمت فی جلد:- پانچ سو پیسے

پہلی بار:- ایک ہزار جلد۔

فہرست

شکریہ

⊙ جموں و کشمیر اکاڈمی آف آرٹس ۔ لینگویجز اینڈ کلچر نے کتاب کی اشاعت میں جو جزوی مالی امداد دی ہے۔ اس کے لئے راقم اکاڈمی کا شکر گزار ہے۔

⊙ جناب علی جواد زیدی صاحب نے اپنی بے شمار مصروفیات کے باوجود اس کتاب کے لئے "پیش لفظ" لکھ کر راقم کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور کتاب ہذا کی قدر و منزلت کو دو بالا کر دیا ہے۔

ریاست میں اپنے قیام کے دوران آپ نے ڈوگرہ زندگی کو قریب سے دیکھا تھا ۔ یہاں کے فن کو پرکھا اور ہمارے بہادری کے گیتوں کی گونج سنی تھی ۔ اس لئے اس کتاب کے لئے آپ کا "آشیرواد" حاصل کرنا ضروری سمجھا گیا ۔

⊙ جناب نور الزماں صدیقی صاحب نور اور جناب پروفیسر نرہری راے زادہ صاحب کے قابل قدر مشورہ کے لئے ہر دو اصحاب کا بھی راقم شکر گزار ہے ؛

وشوا ناتھ کھجوریہ

نذر

منتخب افسانوں کا جسم ڈوگرہ ہے۔ ان کی روح ڈوگری ہے۔ راقم نے انہیں اردو لباس پہنایا ہے اور افسانہ نگاروں کے متعلق چند تعارفی الفاظ اپنی طرف سے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ میرا اپنا کچھ بھی نہیں ہے۔

جن افسانہ نگاروں سے یہ قیمتی شہ پارے [illegible] لئے ہیں۔ اُردو کے جامے میں اُنہیں ہی شکریہ کے ساتھ واپس کر رہا ہوں۔ اُمید ہے کہ وہ اپنی تخلیقات کو اس نئے لباس میں قبول فرمائیں گے۔

(مؤلف)

پیش لفظ!

ڈوگری افسانوں کا انتخاب اردو دان طبقے کیلئے
ایک نیا اور قیمتی تحفہ ہے۔ ریاست جموں و کشمیر کو اردو
سے خاص لگاؤ ہے لیکن یہاں کئی اور ادبی زبانیں بھی رائج
ہیں جنہیں ریاستی آئین میں تسلیم بھی کیا گیا ہے۔ ان علاقائی
زبانوں میں آزادی کے بعد کشمیری اور ڈوگری زبانوں نے
خصوصیت کے ساتھ بڑی تیز رفتاری سے ترقی کی اور یہاں
کئی اچھے شاعر اور ادیب اُبھرے ہیں۔ خود جموں و کشمیر
کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے اردو
ہی درمیانی رابطہ بن سکتی ہے۔ اور کشمیر کے باہر بھی اردو
کے ذریعے سے کشمیر کی مختلف زبانوں کا فن ایک وسیع تر
حلقے تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے وشنوا ناتھ کھجوریہ ہمارے
خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ڈوگری افسانوں
کا اردو روپ ہم تک پہنچانے کی مبارک کوشش کی ہے۔

ڈوگری افسانے ڈوگر دیش کے عوامی زندگی کے افسانے
ہیں۔ اس علاقے کے لوگ جفاکش اور ہمت والے ہیں

غریبی۔ مرض اور جہالت میں بھی مدتوں سے گھرے رہے ہیں لیکن ہر چیز پر زندگی کے ہر شعبے پر اِن کی بہادری اور صاف دِلی کی چھاپ ہے اِس پتھریلے علاقے کی فضا میں رومان اور بہادری کے گیت گونجتے ہیں اور انتہائی نامساعد اور ناخوشگوار حالات میں بھی ڈُگر دیش کا باسی ہار نہیں مانتا۔ وہ حالات کا مقابلہ کرتا ہے چونکہ اِس علاقے کا بہت بڑا حصہ مدتوں تک باہری دُنیا سے کٹا رہا ہے اور تعلیم بھی عام نہیں تھی اِس لئے یہاں توہم اور رسم پرستی کا بھی زور رہا ہے اب نئی روشنی میں سانس لے رہی ہے وہ اِن پُرانے بندھنوں کو توڑ رہی ہے اور خوشی اور خوشحالی۔ علم اور ترقی پسندی کی مشعل ہاتھ میں لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ زندگی کے یہ نشیب و فراز ان افسانوں میں جلوہ گر ہیں۔ اِنہی کے ساتھ ڈگر کے عظیم ماضی کی بھی جھلکیاں ہیں۔ پریم۔ ویرتا اور کلا کی گنگا جمنی زندگی۔ زندگی کے مخالف عناصر سے سرگرم پیکار ہے۔ ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ ان تمام باتوں کا احساس ان افسانوں کے پڑھنے والوں کو ضرور ہوگا۔

افسانے کی دُنیا چھوٹی سی دُنیا ہے۔ اُس میں ناول یا ڈرامہ کا سا پھیلاؤ نہیں ہے پھر بھی اِس چھوٹی سی دُنیا کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں بہت کچھ سما جاتا ہے۔ جو بارہ افسانے اِس مجموعہ میں شامل کئے گئے ہیں وہ ڈوگری زبان کے اچھے اور نمائندہ افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ شروع میں مؤلف نے افسانہ نگاروں کا مختصر سا تعارف بھی کرا دیا ہے۔ بھگوت پرساد ساٹھے۔ رام ناتھ شاستری۔ دھرم چند پرشانت۔ ڈی۔ آر سوران کار۔ نرسنگھ دیو جموال۔ ٹھاکر مدن سنگھ پوچھی۔ نرندر کھجوریہ۔ ویدراہی اور مدن موہن شرما سبھی

ڈوگری کے جانے پہچانے افسانہ نویس ہیں۔ ان سے مل کر اور ان صفحات پر اُن کے افسانے پڑھ کر اُردو والے یقیناً خوش ہوں گے۔

ایسے انتخاب کی ایک اور بھی اہمیت ہے کہ یہ ہمارے عزیز ڈوگرہ دیس میں بسنے والوں کی زندگی، اُن کے دکھ درد اور اُن کے عزائم اور حوصلوں کو سمجھنے میں ممد ثابت ہوتے ہیں اور قومی یک جہتی کی تحریک کو آگے بڑھاتے ہیں جو لوگ اب تک ڈوگرہ دیش نہیں گئے ہیں وہ یہ سمجھ نہیں سکتے کہ یہاں کے لوگ کتنے باہمت، کتنے محنتی، کتنے با اخلاص ہیں۔ میں نے کشمیر کے دوران قیام میں اس علاقہ کو اچھی طرح دیکھا ہے اور دور دور تک گیا ہوں۔ ان کی زندگی کو قریب سے دیکھ کر اُس کے حسن کا قائل ہوا ہوں اور اُس سے محبت کرنا سیکھا ہے اگر یہ افسانے کچھ ایسا ہی جذبہ آپ میں بھی بیدار کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ وشوا ناتھ کھجوریہ کی یہ محنت رائگاں نہیں گئی۔

وشوا ناتھ کھجوریہ سے میں کشمیر میں ملا تھا۔ وہاں کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں اس خاندان کے ایک ایک فرد نے عملی حصہ لیا ہے اور وشوا ناتھ اُن سے الگ نہیں ہیں۔ یہ کہنہ مشق اور باہمت ادیب بیک وقت کئی زبانوں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اُردو ہندی اور ڈوگری تینوں ہی زبانوں میں لکھتے ہیں۔ اس زباندانی کا صحیح ترین مصرف یہی ہو سکتا تھا کہ ان زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کیلئے استعمال کیا جائے۔ میں وشوا ناتھ کی صلاحیتوں سے واقف ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ وہ اسی طرح کے اور مجموعے بھی ہم تک پہنچائیں گے۔ وشوا ناتھ خود بھی تخلیقی ادیب ہیں۔ تخلیقی ادیب کا ترجمہ کی طرف مائل ہونا ایک قسم کی اعلیٰ قربانی ہے لیکن قومی یکجہتی کے نام پر ایسی قربانیاں مبارک ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ یہ مجموعہ اندرون ریاست بھی اور ملک بھر میں بھی ذوق و شوق سے پڑھا جائیگا۔

موتی باغ نئی دہلی
۱۵ مئی سنہ ۱۹۶۶ء

علی جواد زیدی

معذرت

ادب قربانی دینے کا فن ہے۔ مگر بقول فلابیر ''کسی مجموعہ کا انتخاب کرنا اور اُس میں کسی ادیب کی تخلیق کو شامل نہ کرنا مؤلف کے لئے بہت تکلیف دہ امر ہے''۔

اِس اِنتخاب میں جن افسانہ نگاروں کی تخلیقات مجبوری کی وجہ سے شامل نہیں کی جا سکیں۔ اُن سے معافی کا طلب گار ہوں۔

افسانوں کے انتخاب میں شخصیت کو نہیں۔ بلکہ ڈوگری افسانے کے اِرتقا اور سٹائل کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اِس مجموعہ میں ہر طرز و سٹائل کے افسانہ کو نمائندگی حاصل ہو۔ اور ہر چابکدست افسانہ نگار کا کم از کم ایک بہترین افسانہ اپنا مقام حاصل کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ افسانہ ڈوگری ادب کا بہترین شاہکار نہ ہو۔

اُردو ترجمہ کیوں؟

ہندوستان کُرۂ ارض کی ۱۲۵۹۷۹۷ مربع میل سطح پر پھیلا ہوا ہے اور دُنیا کی ایک قدیم ترین تہذیب کا دعویدار ہے۔ اُنچاس کروڑ [۴۹] انسانوں کے اِس عظیم ملک میں ۸۴۵ زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے چودہ زبانوں کو دستورِ ہند نے تسلیم کیا ہے اِتنے بڑے ملک میں زبان۔ خدو خال۔ مذہبی اعتقادات اور خیالات میں تفاوت قدرتی امر ہے۔ لیکن اِس تنوع اور رنگا رنگی کے باوجود یہاں یگانگی بھی ہے۔ مراٹھی۔ گجراتی۔ بنگالی۔ پنجابی۔ ڈوگرے یا کشمیری ہوتے ہوئے بھی ہم ہندوستانی ہیں۔ ہندو مسلم سکھ یا عیسائی اور بودھ ہوتے ہوئے بھی ہم ایک ہیں۔ ملک کی آزادی کی رکھشا اور مجموعی خوشحالی کیلئے قومی اتحاد و اتفاق کی آج بھی ضرورت ہے کہ کیرل کا درد کشمیر میں اور بنگال کی بیکلی گجرات میں محسوس ہو۔ اسی ملک گیر ہمدردی کا تقاضا ہے کہ "مضراب" کہیں کسی ایک تار کو چھوئے تو "سازِ وطن" جھنجھنا اُٹھے۔ آج ملک کے دانشمند اس بات پر متفق الرائے ہیں کہ قومی اتفاق و اتحاد کو قائم رکھنے اور اُسے زیادہ مضبوط بنانے کیلئے ضروری ہے کہ ملک کے مختلف حصوں کے لوگ ایک دوسرے کے خیالات و جذبات کو سمجھیں۔ ایک

دوسرے کے معاشرے سے واقف ہوں اور ایک دوسرے کے ثقافتی ورثے سے فیض یاب ہوں۔

اِس بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ یہ مقاصد ہندوستانی زبانوں میں تال میل پیدا کرنے سے اور مختلف زبانوں کو ایک دوسری کے قریب لانے سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں یا پھر ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ کر کے بھی ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

اسی غرض سے ڈوگری کے منتخب افسانوں کا یہ مجموعہ اُردو زبان میں پیش کیا جا رہا ہے تا کہ ڈوگری زبان سے ناواقف اُردو دان حضرات ڈُگر کی زندگی کو پاس سے دیکھ سکیں۔ اُس کے فن و ادب کا جائزہ لے سکیں۔

مجموعہ کے اکثر افسانے شاہد ہیں کہ ملک کے اِس حصہ کی بیشتر آبادی اگرچہ غُربت میں زندگی بسر کر رہی ہے لیکن غُربت کے باوجود زندگی کی باسمار تاروں کی دعویدار ہے اور تمام مُشکلات پر قابو پانے اور بھرپور باوقار زندگی بسر کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ مُفلسی کی اِن گہری کھوئیوں ہی سے وہ سُورما پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے تاریخِ شجاعت میں عالمگیر شہرت حاصل کی ہے اور اُن فنکاروں نے جنم لیا ہے جن کی مصوّری کی دھاک عالم میں بندھی ہے۔ ڈُگر کی اِن ہی فنی روایات سے متاثر ہو کر کسی نے کہا تھا ؎

یہ ڈُگر کی دھرتی یہ فن کے نمونے
میں پتھر سے چشمے رواں دیکھتا ہوں

ڈُگر کے پہاڑی علاقے میں چند غیر صحت مند رسُومات در رواج پائے جاتے ہیں (اگرچہ تعلیم کی روشنی میں وہ زوال پذیر ہو رہے ہیں)۔ جو یہاں کے عوام کی غُربت و پسماندگی کے کافی حد تک ذمہ دار ہیں۔ اِس انتخاب کے بہت

سے افسانوں میں اُن رسومات کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ اور یہ امر باعث تسکین ہے کہ ڈوگری ادب شعوری یا غیر شعوری طور پر اسما پر کافی حد تک اثر انداز ہوا ہے۔ یہ ترجمہ اُن امور کو سمجھنے میں اور اس طرح عظیم جمہوریہ ہند کی اس اکائی (ڈگر دیش) کی زندگی کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

ڈوگری زبان کا راجستھانی۔ گجراتی۔ پہاڑی وغیرہ زبانوں سے نزدیکی اور پنجابی سے اور بھی نزدیکی رشتہ ہے۔ لیکن ان ڈوگری انسانوں کو اردو زبان میں پیش کرنے میں کئی بار قلم رُک رُک گیا ہے کیونکہ ایک زبان کی ادبی باریکیوں، تشبیہات اور محاوروں کا دوسری زبان میں صحیح و سالم ترجمہ کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ ہر زبان کی اپنی علاقائی خصوصیات ہوتی ہیں۔ کچھ انوکھا پن ہوتا ہے جو دوسری زبان کا لباس پہن لیتے پر درہم برہم ہو جاتا ہے اسی لئے طالسطائی نے ترجمہ کو ایک خوبصورت قالین کی اُلٹی طرف سے تشبیہہ دی ہے۔

مشمول افسانوں کی زبان اور ان میں اُبھرتے جذبات اور ان کی ادبی نگارش کو اردو زبان کے سانچے میں ڈھالنے میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اس کا اندازہ قارئین ہی کر سکیں گے۔ راقم اپنی طرف سے اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ اس مجموعہ کی ادبی خوبیوں کیلئے داد کے مستحق وہ افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے اس انتخاب میں شامل ہیں اور تمام ترخامیوں کیلئے مؤلف ذمہ دار ہے ۔

مؤلف

تعارف

بھگوت پرساد ساٹھے (پیدائش ۱۹۱۰ء)

آپ کی پیدائش قصبہ رام نگر کے ایک ایسے برہمن خاندان میں ہوئی۔ جس کی جنگی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ بچپن میں ہی والد کا سایہ اُٹھ جانے سے بھگوت پرساد ساٹھے اپنی کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنی زمینداری کی دیکھ بھال کرنے کے لئے جموں سے رام نگر چلے آئے۔ پڑھائی کے دوران ہندی۔ اردو اور انگریزی افسانے پڑھنے کا شوق آپ کے اندر اجاگر ہو چکا تھا۔

فرصت کے وقت آپ اپنی آسامیوں اور گرد و نواح کے دیہاتیوں سے ملنے جلنے اور اُن کی زندگی کو نزدیک سے دیکھنے کے لئے آس پاس کے گاؤں میں چلے جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی رام نگر کی سٹیج پر ڈرامے کھیلا کرتے تھے۔ آپ کی طبیعت میں ملنساری خداداد ہے۔ اور علمِ نجوم آپ کو اپنے والد پنڈت برمانند جی سے ورثہ میں ملا ہے۔ اس لئے جہاں بھی جاتے لوگوں میں گھل مل جاتے۔ سیانے لوگ اپنے اپنا ہاتھ یا جنم پترہ دکھاتے تو بچے کہانی سننے کا تقاضا شروع کر دیتے اور ساٹھے صاحب کوئی پرانی لوک کتھا یا کوئی من گھڑت کہانی سنا دیتے

آہستہ آہستہ آپ کے اندر کا افسانہ نگار بیدار ہوتا گیا اور ۱۹۴۰ء کے آس پاس آپ نے ڈوگری افسانے لکھنا شروع کر دیئے۔ یہ افسانے مکڑی کے جالے کی طرح چند ایک از بس ضروری لیکن باریک تاروں سے کسی مرکزی خیال کے گرد تنے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۹ء میں آپ کے چنے ہوئے نو افسانوں کا ایک مجموعہ "پہلا پھول" شایع ہوا۔ ان افسانوں میں علاقہ رام نگر میں بسنے والے محنت کش عوام کی سماجی زندگی کی جھلک ملتی ہے "سمدھی کا گلہ" (گُڑیے دا الاہمہ) مجموعہ ہذا کا سر فہرست افسانہ ہے۔ جس میں پہاڑی علاقہ میں بسنے والی جوگی قوم (جو اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے) کی طرزِ معاشرت کے کچھ زاویے پیش کئے گئے ہیں۔

مجموعہ ہذا کے افسانوں کے علاوہ آپ کے کچھ افسانے دیگر رسالہ میں شایع ہو چکے ہیں۔

اٹھارہ سال تک بمبئی میں جیوتش کا دھندہ کرنے کے بعد اب آپ جموں واپس آ گئے ہیں۔

رام ناتھ شاستری (پیدائش ۱۵ اپریل ۱۹۱۴ء)

آپ ڈوگری ادب کے دورِ جدید کے روحِ رواں ہیں۔ آپ کی ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ دراصل اس قدر کے ڈوگری ادب کا ہی تذکرہ ہے نئے ادیب تیار کرنے۔ اُن کی حوصلہ افزائی کرنے میں ڈوگری ادب میں آپ کا وہی مقام ہے جو ہندی میں مہاویر پرساد دویدی کا رہا ہے۔

آپ ہندی کے پربھاکر، اور سنسکرت میں شاستری اور ایم۔ اے ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں آپ پرنس آف ویلز کالج جموں میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ آجکل گاندھی میموریل کالج جموں میں پروفیسر ہیں۔

۱۹۴۴ء میں چند ساتھیوں کے تعاون سے آپ نے "ڈوگری سنستھا" جموں۔ نام کی انجمن قائم کی تھی جو ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی علمبردار ہے۔ شاستری جی صحیح معنوں میں اس کے "میر مجلس" ہیں۔

کہانی لکھنے کا آپ کا شوق پرانا ہے۔ کالج میں پڑھتے ہوئے آپ کالج میگزین کے لئے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء سے پہلے آپ ہندی میں لکھا کرتے تھے۔ اُن میں سے چند کہانیوں۔ "شرابی کا اُپدیشا" وغیرہ میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ تیکھاپن بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ بیشتر کہانیوں پر "آدرش واد" کا اثر بھی غالب تھا۔

۱۹۴۷ء سے آپ ڈوگری ادب کی ترویج و اشاعت کو فروغ دینے میں جی جان سے مصروف ہیں۔ آپ نے کہانیوں کی طرف کم اور

شعر و شاعری کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ آپ کی شاعری فکری ہے۔
ادبی مضامین اور ناٹک لکھنے کی بھی رغبت رکھتے ہیں۔ ہندی کی بیس ۲۰ پچیس ۲۵ کہانیوں کے علاوہ آپ نے ڈوگری میں اب تک پندرہ ۱۵ کہانیاں لکھی ہیں۔ کسی سچے واقع کو تخیل کا رنگ۔ روپ دے کر آپ اس میں کہانی کا "رس" ڈال دیتے ہیں۔ اس انتخاب میں شامل دو کہانیوں کے بارے میں آپ نے بتایا تھا۔ "بدنامی کی چھاؤں" کی سیتا کو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ جسودھا نندن کا نام فرضی ہے۔ اور نندلال میرے تخیل کی پیداوار ہے۔ سیتا کتنے برس منتظر رہی۔ اپنی اس کہانی کے لئے یہ فرض پورا کر لینے پر میرا "جی" ہلکا ہوا ہے۔

"تیسرے اکھنڈ پاٹھ" کے منگل سنگھ کی کہانی میں نے کسی ریٹائرڈ فوجی افسر سے سُنی تھی جس میں ۱۹۴۷ء کے منگل سنگھ کے اندر کا "انسان" ۱۹۶۵ء میں "مرتا ہوا" دکھایا گیا ہے۔ میں نے اس "انسان" کو اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ منگل سنگھ کی زندگی کے دو پہلو اُبھارنے کیلئے دلیپ سنگھ کی تخلیق کی گئی ہے۔ ... اِسی تخیل کے سہارے میں اپنے کرداروں کے ذہن میں اُتر کر اُن کی نقاشی کرتا ہوں۔"

شاستری جی نے "ٹیگور کی گیتا نجلی۔ میگھ دوت اور بھرتری ہری" کا ڈوگری میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔

دھرم چند پرشانت۔ (پیدائش ۱۹۱۷ء)

دھرم چند پرشانت کہنہ مشق ادیب ہیں۔ "پریم ساگر"، "سکھ ساگر" اور کچھ "پوران" آپ نے چھوٹی عمر میں ہی پڑھ لئے تھے۔ گیارہ سال کی عمر میں درسی تعلیم کے علاوہ آپ نے "مہابھارت" پڑھی اور تاریخی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔ جس کی چھاپ آپ کے تاریخی افسانوں پر پڑی ہے۔

۱۹۳۱ء میں آپ کی پہلی ہندی کہانی "ہندی ملاپ" لاہور میں چھپی تھی۔ اس کے بعد "مادھوری" اور دوسرے ہندی رسالوں میں آپ کی کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ ڈوگری میں لکھنے کی ابتدا آپ نے ڈرامہ سے شروع کی اور کچھ دیر بعد ہی آپ ڈوگری افسانہ کے میدان میں آگئے۔ اس وقت تک تیس ۳۰ ڈوگری افسانے لکھ چکے ہیں جن میں سے بیشتر ڈوگری رسالہ "نمی چاننا" اور "ریکھا" میں چھپ چکے ہیں۔ آپ کا ڈوگری ڈرامہ "دلہ کا جنم" اور دو افسانوی مجموعے "اُچی آل دھاراں" (اونچے پربت) اور "گجرے" شائع ہو چکے ہیں۔

"آج کی کہانی" کی تیکنک آپ کو پسند نہیں۔ تواریخی پس منظر میں کہانی لکھنے کا شوق رکھتے ہیں "آخری قربانی"، "بھور گڑھ کی کنجی"، "نیلم کا بھید" اور "نورجہاں کا مقدمہ" اِس موضوع کے آپ کے قابلِ ذکر افسانے ہیں۔

ہندی کے افسانہ نگاروں میں پریم چند۔ جینندر
اور سدرشن کی کہانیاں آپ کو اچھی لگتی ہیں۔ لیکن بنگال
کے مشہور افسانہ نگار شرت چندر کے افسانے آپ
کے ذہن پر دائمی اثر چھوڑ گئے ہیں۔ آپ بنگالی۔ مراٹھی اور
تامل کہانیوں کے ترجمے اور مغربی ادیبوں میں طالسطائی۔
گورکی اور موپاساں کے افسانے پڑھنے کا کافی شوق رکھتے ہیں
آپ نے اعتراف کیا کہ پرنا بن لال ورما کی طرز اور تکنیک کا
آپ کے افسانوں پر کافی اثر ہے۔ آپ "ادب برائے ادب" کے
نظریہ کے قائل ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ کہانی دل بہلانے کا ایک
کامیاب ذریعہ ہے۔ آپ کے ڈوگری افسانہ "نرس" کا ہندی
اردو اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ "چھچھیلو" کو آپ
اپنا بہترین افسانہ سمجھتے ہیں۔ آپ کا پیشہ جرنلزم ہے۔

ڈی۔ آر۔ سوزنگار (پیدائش ۱۹۲۹ء۔ وفات ۱۹۶۲ء)

گھر کی غربت اور سماج میں پھیلے بھرشٹاچار نے آپ کو افسانہ
لکھنے پر مجبور کیا۔ "اندھیرا اور سویرا" آپ کا پہلا اور نہایت کامیاب
مختصر افسانہ ہے۔ جس میں رشوت خوری اور بھرشٹاچار پر گہری چوٹ
کی گئی ہے۔ دوسرے افسانہ "واپسی" میں آپ نے غربت کے
ماحول کو ابھارا ہے۔ ڈوگری ادب کو آپ یہ دو گوہر ہی دے
پائے تھے کہ اجل انہیں اٹھا لے گئی۔ جون ۱۹۶۲ء کو "سدھ مہادیو"

جاتے ہوئے ایک حادثہ میں آپ جاں بحق ہو گئے۔ غربت سے اُبھرتا ایک گھرانا برباد ہو گیا ؎

آہ گلچینِ اجل سے کیسی نادانی ہوئی
پھول وہ توڑا کہ گلشن بھر میں ویرانی ہوئی

نرسنگھ دیو سنگھ جموال (موضع جلوال پیدائش ۲۸ فروری سنہ ۱۹۳۱ء)

ایامِ طالب علمی سے ہی انشاء پردازی کی طرف آپ کو رغبت رہی ہے۔ اِس کے لیے آپ آج تک اپنے اُردو، فارسی کے اُستاد مرحوم تپش صاحب کے مرہونِ منّت ہیں۔ اُسی زمانہ میں آپ نے پہلا اُردو افسانہ لکھا تھا۔

آپ کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی لیکن دلکش مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی چھائی رہتی ہے۔ آپ کافی کم گو ہیں۔ آپ سے گفتگو کرتے وقت یوں لگتا ہے کہ آپ جو کچھ کہہ چکے ہیں اُس سے بہت زیادہ بات اَن کہی رہ گئی ہے۔ آپ کے افسانوں کے بیشتر کرداروں میں یہ ضبط یا گھٹن نمایاں ہے۔ آپ کا جذباتی مطالعہ کافی گہرا دکھائی دیتا ہے۔ "جمنا"، "سہاگ رات" اور "دھنکیے اُٹھے" اس امر کے شاہد ہیں۔ اِس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ تین سال کی عُمر میں ہی جب آپ کی والدہ کا اِنتقال ہو گیا۔ تو آپ کو دُنیا

ویران سی دکھائی دینے لگی۔ آپ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ آپ کے ذہن میں غم کی ایک گرہ سی پڑ گئی اور طبیعت میں سنجیدگی آگئی

نرسنگھ دیو سنگھ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ ڈوگری کے اچھے شاعر اور ایک سلجھے ہوئے مصوّر بھی ہیں۔ لیکن یہ سنجیدگی آپ کے فن کے ہر شعبہ پر مُسلّط دکھائی دیتی ہے۔

آپ کے افسانوں کے موضوع اور کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہ موضوع آپ نے ملٹری اور پولیس کی ملازمت کے دوران عملی زندگی سے حاصل کئے تھے۔ آپ کے اکثر افسانے طنز و مزاح سے شروع ہو کر سنجیدگی اختیار کرتے ہیں اور کبھی کبھی نفس کُشی پر انجام پاتے ہیں۔

قلیل عرصہ میں بھی آپ نے "جمعدار" اور "شناختی" جیسے کامیاب افسانے لکھ لیئے ہیں۔ آپ کے سات ڈوگری افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔

ٹھاکر مدن سنگھ پونچھی (پیدائش ۱۹۳۱ء مقام پونچھ)

آپ نامور اُردو ادیب ٹھاکر پونچھی کے برادر اصغر ہیں۔ چھوٹی عُمر میں ہی والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کی وجہ سے آپ کے دل کی افسردگی نے آوارگی کی صُورت اختیار کر لی اور خواہشات ناتمام نے ہلکی موسیقی کی طرف آپ کو راغب کر دیا۔ لیکن یہاں بھی کوئی مقام نہ بنا سکے۔ گھر میں اکثر کرشن چندر، چراغ حسن اور

پریم چند کا ادبی چرچا ہوتا رہتا تھا۔ اس سے افسانے پڑھنے کا شوق تو پیدا ہو گیا مگر آپ کے اندر کا افسانہ نگار تا حال پیدا نہ ہوا تھا۔

جموں آنے پر جب ادیبوں سے ربط قائم ہوا۔ تو آپ نے افسانہ لکھنے کی طرف رجوع کیا۔ آپ نے پہلا ڈوگری افسانہ "تھنا" ۱۹۶۲ء میں لکھا تھا۔ آپ کو کہانی لکھنے کا 'جنون' نہیں ہے طبیعت آنے پر ہی لکھتے ہیں۔ اس وقت تک دس۔ بارہ افسانے ہی لکھ سکے ہیں۔ لیکن اچھے لکھے ہیں۔ ان میں سے تین۔ چار افسانوں کے ہندی۔ اردو ترجمے مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

"سورگ سیڑھی" کا ہندی ترجمہ دہلی کے ہندی ماہنامہ "دس کہانیاں" میں "جب رات جاگتی ہے" اور "جہاں اندھیرا نہیں"۔ افسانے "تلاش" دہلی اور "پگ ڈنڈی"۔ امرتسر میں اشاعت پا چکے ہیں۔

"سورگ سیڑھی" آپ کا بہترین افسانہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کراچی کے "الشجاع" نے اپنے فروری ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں لکھا ہے۔ "... سورگ سیڑھی بلاشبہ کامیاب افسانہ ہے اور نئے لکھنے والے کی نشان دہی کرتا ہے ....."۔ آپ کے افسانوں کا عام موضوع سماجی ہے۔ آپ زندگی کو شاداب کرنے والی حقیقت کی بنیاد پر افسانہ کھڑا کرتے ہیں۔ "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" حد اعتدال تک دونوں نظریوں کے ہی آپ قائل ہیں۔ ایک ملاقات میں آپ نے اعتراف کیا تھا۔ "مجھے کہانی کار بنانے میں نریندر کھجوریہ کا زیادہ ہاتھ ہے ....."

نریندر کھجوریہ (پیدائش ۱۶ جنوری ۱۹۳۳ء بمقام جموں)

ادبی میدان میں آنے سے پہلے نریندر کھجوریہ علاقہ رام نگر کے ایک پہاڑی سکول میں مدرس مقرر ہوئے۔ وہاں آپ نے "ڈگر" کی پسماندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہاں آپ کو وہ حقیقی کردار اور موضوع ملے جنہوں نے اُن کے دل کو جھنجھوڑ کر انہیں کہانی کار بنا دیا۔

جہالت اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے شکار اور قسمت کے سہارے زندگی کا چھکڑا کھینچنے والے لوگوں کو نریندر نے اپنے تخیل اور فن سے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

ادبی جبلتیں نریندر کے اندر بچپن سے ہی موجود تھیں۔ پانچویں جماعت میں پڑھتے ہوئے آپ نے "میرا پرچہ" کے لئے ایک اُردو کہانی لکھی تھی۔ آپ کا پہلا ڈوگری افسانہ ہے "دِلیا ہار"۔

راجندر سنگھ بیدی۔ راجندر یادو۔ موہن راکیش اور نرمل ورما آپ کے محبوب ادیب ہیں۔ اور ادب کے نئے رجحانات کا آپ کے ادب پر کافی اثر دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے اکثر افسانے المیہ ہیں۔

ڈوگری ادب کی حدود سے نکل کر اب آپ نے ہندی کی طرف رجوع کیا ہے اگرچہ ڈوگری میں بھی لگاتار لکھ رہے ہیں۔

آپ کی تصنیفات:-

ڈوگری:- (۱) کولیں دیاں لکیراں (افسانے)۔ (۲) نیلانو (ناول)

(۴) "اَمیں بھاگ جگانے : ایے آں"۔ (مجموعہ ایکانکی ناٹک۔ جموں کشمیر اکیڈمی سے اول انعام یافتہ)۔ (۴) "رنگ کہانیاں" (بچوں کیلئے) (۵) "تھوندیاں کنارھاں" (ناٹک۔ اکیڈمی سے انعام یافتہ)

ہندی :- (۱) راستے میں (کہانیاں) (۲) کانپتی دیہہ ڈوبتا دل" (ڈرامہ) (۳) سات ایکانکی (۴) راستے۔ کانٹے اور ناخن (ڈرامہ جموں کشمیر اکیڈمی سے اول انعام یافتہ (۵) "نائے وی بُن (غلطی)

آج کل آپ جموں کشمیر اکیڈمی کے ہندی "شیرازہ" کے مدیر کے اہم فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔

وید راہی (پیدائش ۲۲ مئی ۱۹۳۳ء)

آپ کے والد لالہ ملک راج صراف ایڈیٹر "رنبیر" ریاست جموں وکشمیر میں جرنلزم کے بانیوں میں گنے جاتے ہیں۔ گھر کے ایسے ماحول کی وجہ سے وید راہی کو بچپن میں ہی لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے آپ کی سکولی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اٹھارہ سال کی نوعمری میں ہی آپ نے اخبار نویسی کی طرف رجوع کیا اور ۱۹۵۱ء میں بمبئی کے ہندی ماہنامہ "سرگم" کے معاون مدیر کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ اس کے بعد آپ فلمی دنیا میں جا پہنچے ۱۹۵۵ء میں ریڈیو سٹیشن جموں کے اسٹاف میں آپ کی تقرری ہوئی لیکن پھر جرنلزم کے بلاوے پر کشمیر گورنمنٹ کے سرکاری ہندی

ماہنامہ "یوجنا" کے ایڈیٹر کے اہم فرائض نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دینے لگے۔ لیکن آج کل پھر ممبئی جاکر آزادانہ طور پر تصنیف و تالیف کا کام کر رہے ہیں اور ہندی کے جدید افسانہ نگاروں میں آپ نے اپنا ایک مقام بنا لیا ہے۔

تصانیف:۔

ڈوگری:۔ ۱۔ "کالے ہتھ" (افسانے)۔ ۲۔ "دھارں دے اتھرو" (ناٹک) ۳۔ "ہاڑ۔ بیڑی تے پتن"۔ (ناول)

اُردو:۔ "جگدیاں جوتاں" (ڈوگری شاعروں کا مجموعہ کلام اور تنقید)

ہندی:۔ "سیما کا پتھر" اور "ٹوٹتے بندھن اور نئی پود" دو افسانوی مجموعے

وید راہی کے پہلے دور کے لگ بھگ سبھی ڈوگری افسانوں میں شہری تہذیب اور شہری لوگوں کی ذہنی کیفیت کی نگارش کی گئی ہے۔ بعد میں اپنے ہم عصر ادیبوں کی طرح وید راہی صاحب نے بھی اپنے قلم کا رُخ دیہات کی طرف موڑ لیا۔ ایسا ہی آپ کا ایک ڈوگری شاہکار ہے "ایہہ پربت میرے نہیں"۔

مدن موہن شرما

(پیدائش ۱۹۳۴ء)

شرما صاحب ایم۔ اے (انگریزی) اور گورنمنٹ آیوروید کالج جموں میں انگریزی کے لیکچرار ہیں۔ آپ کو اپنی مادری زبان سے بہت پیار ہے شروع شروع میں آپ نے ایک درجن کے قریب اردو افسانے لکھے تھے

لیکن ۱۹۵۴ء سے لگاتار ڈوگری میں ہی لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ کیونکہ کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور ہیں۔ ڈوگری میں پہلی کہانی۔ "ڈھکرڈو کی آل چرڈھال"۔ آپ نے ۱۹۵۲ء میں لکھی تھی۔

۱۹۵۸ء میں آپ کے چھ ڈوگری افسانوں کا مجموعہ "آخری انسان"۔ چھپا تھا۔ دو سال بعد ڈوگری ناول " دھاراں تے دھوڑاں" (پربت اور دھندیں) اور چھ افسانوں کا ایک اور مجموعہ "چاننی رات" شائع ہوئے۔ اس وقت گیارہ افسانوں کا مجموعہ " تاروں کی چھاؤں تلے" پریس میں ہے۔ ایک ڈوگری ناول" میں ایک بہتی گنگا" اور " پچیس ہزار سال پرانا انسان (ناولٹ) بے تابی سے اشاعت کے منتظر ہیں۔ کل ملاکر چالیس کے لگ بھگ افسانے آپ ڈوگری ادب کو دے چکے ہیں۔ افسانے بلند انسانی قدروں کے دعویدار ہیں ان میں طنز۔ شوخی۔ مزاح۔ سنجیدگی گویا ہر مزاج پایا جاتا ہے۔

لگاتار ادبی ریاضت سے مدن موہن کے ادب میں فنی پختگی آگئی ہے اور آپ کی ادبی قدروں میں واضح تبدیلی آ رہی ہے جابجا افسانوں میں واقعات نگاری کے علاوہ آپ کے ہاں انسان کے تحت الشعور اور نفسیات کا عمیق مطالعہ پایا جاتا ہے۔ اب آپ افسانہ کی پرانی تیکنیک کی حدود سے نکل کر ڈوگری افسانہ کو نئے موڑ دے رہے ہیں۔ آپ کا میلان طبع اب شعوری بہاؤ کی طرف ہے آپ کا افسانہ " لال ٹین" اس جانب پہلا قدم ہے۔

پریم چند۔ اشک اور گرش بابل کی طرح آپ کو بھی اپنے کردار سے محبت ہے۔ " پہاڑی کوا"، کے گوجرو اور نورانی آپ کے عزیز

ترین کردار ہیں :

ڈوگری ادب کو آپ سے بہت سی اُمیدیں ہیں ::

افسانے

"سُمدھی کا گِلہ"

(ڈُکرے دا لاہمہ)

از- بھگوت پرشاد ساٹھے

کشن پورہ - تھپلال - گھوڑ ڈی اور تھاٹین یہ پانچ گاؤں موہرو جوگی کے حدِ اقتدار میں تھے۔ موہرو کے گھر میں اُس کی نوجوان اکلوتی بیٹی کیسرو کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ موہرو سمجھتا تھا کہ ان پانچوں گاؤں کے ہر فرد و بشر کی فلاح و بہبود کی نگہبانی اس کے ذمہ ہے اور یہ دعویٰ کافی حد تک درست بھی تھا۔ زمین بونا، جوتنا اور اس کی نُلائی۔ گوڈی تو کاشتکار کے بس کی بات ہے۔ لیکن تیار فصل پر گھرے بادلوں کا رُخ موڑنا اُس کے بس میں نہیں۔ اگر موہرو جوگی اپنی کرامات سے اُس طوفان کا رُخ نہ پلٹے تو اولوں کی بوچھاڑ سے اشبود سب غارت کر دے۔ فصل تباہ کر دے"۔ موہرو جوگی کے اس دعویٰ کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔

جوگیوں کی بیٹیاں جوگی لوگ ہی بیاہتے ہیں۔ لیکن موہرو کو

اپنی کیسرو کے لئے کوئی اچھا گھر تلاش کرنا مُشکل ہو گیا۔ اس کی حالیسِت کے قریب گنگو جوگی کا بیٹا اُس کی نِگاہِ انتخاب میں تھا تو سہی لیکن وقار کی دیوار بیچ میں حائل تھی۔ کیونکہ عُمر بھر دونوں جوگی ایک دوسرے پر اپنے کسب کا وار کرتے رہے تھے۔ اب کس مُنہ سے موہترو اپنی بیٹی کی سگائی کی بات اُس سے کرے؟۔ آخر کسی تیسرے آدمی کی وساطت سے بات چلی اور گنگو جوگی کے بیٹے کے ساتھ کیسرو کی سگائی طے پائی۔

گنگو جوگی کی چھاتی گز بھر کی ہو گئی۔ اپنے کسب میں آج تک وہ موہترو سے بازی نہ لے سکا تھا۔ لیکن بیٹے کے اِس رشتہ کی بدولت اُس نے اُستادِ فن موہترو کو اپنے سامنے گردن جھکانے پر مجبور کر دیا تھا۔

موہترو نے کیسرو کو بھی اپنے فن میں طاق کر دیا تھا۔ کیونکہ یہی اُن کا ذریعہ معاش تھا اور اسی کی بدولت وہ اپنے بھائیوں کے سامنے فخر سے سر بلند کر سکتے تھے۔

ماہ پھاگن کے آخری ایام تھے۔ گیہوں کے دانے خوشوں کے اندر پک چکے تھے۔ لیکن پوری طرح خشک نہ ہوئے تھے۔ کاشتکار کے لئے یہ بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ اگر سنبھل گیا تو کم از کم چھ مہینوں کے لئے وہ کامیاب کسان۔ ورنہ اُس کی قسمت کے ساتھ وابستہ لوہار۔ بڑھئی۔ پنڈت۔ پروہت۔ جوگی اور فقرا کو بھی اپنے اپنے پیٹ پر پٹیاں باندھنی پڑ جائیں۔

موہترو جوگی کو ایسے ڈھیٹ بخار نے آ دبوچا جو جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ گاؤں کے لوگ بارش کے راجہ اِندر سے دُعائیں مانگنے لگے کہ موہترو کے صحت یاب ہونے تک کوئی آسمانی آفت اُن کے کھیتوں

پر نازل نہ ہو۔ لیکن انسان جو کچھ سوچتا ہے وہ سب پورا نہیں ہوتا۔
اُس کی ہر تمنا بر نہیں آتی۔ کبھی کبھی ایشور اپنی مرضی کی بھی کر دیتا ہے
ایک دن سرِ شام بڑے بڑے سیاہ بادل نمودار ہونے لگے اور
دیکھتے ہی دیکھتے آسمان بادلوں سے ڈھنپ گیا تو لوگوں کے دل کانپ
اُٹھے کہ اب خیر نہیں۔ اُدھر بادلوں کا رتھ چڑھ آیا۔ اِدھر اس کا رُخ
پلٹنے والا کوئی نہیں۔ بچارہ موہرو بستر سے چپکا پڑا تھا۔ اُس
نے اپنی کوٹھڑی کے اندر کیسرو سے وحشت ناک خبر سُنی تو تڑپ کر
رہ گیا۔ ایک آہ بھر کر اُس نے کیسرو سے کہا "بیٹی۔ اب لاج تیرے
ہاتھ ہے۔ ان بادلوں کو اپنے حلقہ کے گاؤں میں نہ برسنے دینا اور نہ ہی انہیں
گنگو کی حد کی طرف جانے دینا۔ کیا ہوا جو تیری شادی ابھی نہیں ہوئی
لیکن سسرال تو وہیں ہے۔ شاباش بیٹی! رتھ کو پیچھے دھکیل دے"۔
لیکن باپو کی اس ہدایت سے پہلے ہی کیسرو منتر پڑھ کر اور "مور مٹھے"[۱]
لہرا لہرا کر دو۔ تین چٹکے بھبھوت کے گنگو کی حد بست کی طرف ہوا میں
اُڑا چکی تھی۔ اُس بپھرے ہوئے طوفان کو پھر واپس لوٹانا انجان کیسرو
کی پہنچ سے باہر تھا۔ پھر بھی اُس نے جلدی سے باہر جا کر "مور مٹھے" کو
دوسرے رُخ ہلا ہلا کر منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ منتروں نے بادلوں میں پہنچ
کر نشتر کا سا کام کیا۔ بادلوں کے سینہ میں ہل چل مچ گئی۔ ہوا نے آندھی
جھکڑ کا روپ دھارن کر لیا۔ بادلوں کا رتھ درمیان سے پھٹ کر پیچھے
مڑنے لگا۔ کیسرو اُسے اور پیچھے دھکیلنا چاہتی تھی۔ تھی تو وہ اُستاد کامل
موہرو جوگی کی بیٹی۔ لیکن آخر انجان تھی۔ بے چاری گھبرا اٹھی۔ اُسے سمجھ
نہ آیا۔ کہ اژدہے کی طرح بپھرے اور بیچ سے پھٹے طوفان کا رُخ

۱۔ مور کے پروں کی گٹھی

کیونکر موڑے ؟ ؛ آدھا طوفانی رتھ بڑی تیزی کے ساتھ گنگو جوگی کی حد کی طرف بڑھنے لگا۔

کیسترہ بلبلاتا سا ہو کر موہیرہ کے پاس گئی: "باپو! اب میں کیا کروں؟"

موہیرہ کی آنکھیں مارے ندامت کے جھک گئیں۔ اب وہ اپنے گرٹھم (سمدھی) کو کیا منہ دکھائے گا۔

کیسترہ باپ کی پریشانی جان گئی ---- وہ جلدی سے باہر چلی آئی۔ اپنے خاندان کی لاج تو اس نے بچا لی تھی ---- لیکن سسرال والوں کی "مگر سسرال بننے ہی کیوں دیا جائے"؟۔ صحن میں کھڑے ہو کر اس نے یہی فیصلہ کیا۔

ایک درانٹ[1] ہاتھ میں لے کر اور دیوی "چامنڈا" کا خوفناک روپ دھارن کر کے وہ تیزی سے ایک طرف بھاگ گئی ۔۔۔۔۔

اندھیری رات۔ بیابان جنگل۔ انسانی جان کے دشمن جنگلی درندوں کی مملکت میں وہ کہاں چلی گئی؟ ---- کون جانے! اس کے بعد موہیرہ جوگی کو نہ اس کی کیسترہ ہی ملی اور نہ ہی کبھی اپنے سمدھی کا گلہ! ۔۔

---

[1] گنڈاسہ

بدنامی کی چھاؤں

(از پروفیسر رام ناتھ شاستری)

آج ایتوار ہے۔ ماسٹر نند لال کو سکول نہیں جانا ہے۔ سوچنے لگا۔ "کیوں نہ بازار کا چکر لگا آؤں؟ بھاوج ابھی مندر گئی ہیں۔ کھانا تو آج دیر سے ہی بنے گا"۔ پینٹ چپل پہنے تھا۔ بش شرٹ اُس نے کھونٹی سے اتاری اور پہنتا ہُوا باہر نکل گیا۔ بائیں ہاتھ والی گلی سے ڈھولک کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ اُسے یاد آیا۔ بھاوج نے کہا تھا۔ "دشالیوں کے ہاں لڑکی کی شادی ہے وہاں جاکر کام پوچھ آنا۔" چلو شام کو ہو آئیں گے۔

ڈھولک کی تال پر "سوہاگ" کے یہ بول اُسے سنائی پڑے:۔

"بیٹی، چندن کی اوٹ کیوں کھڑی ہے؟"

"میں تو اپنے بابل کے پاس کھڑی ہوں۔ میرے لئے ور کی تلاش کیجئے پتا جی!"

"بیٹی! تیرے لئے کیسا ور تلاش کروں؟"

"جو تاروں میں چاند جیسا ہو۔ اور چاندوں میں بھی کنہیا جیسا (خوبصورت) ہو۔ میرا دولہا رام جیسا ہو۔ دیور لچھمن جیسا ہو۔ (میری) ساس مہارانی کوشلیا جیسی ہو اور سسر مہاراجہ دشرتھ جیسا ہو

ہو۔ یہ سن تو رہے تھے پہل بنانے کے

میں تو (سیتا کی طرح) اجودھیا کا راج مانگتی ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔!"
لڑکیوں کی آواز میں اتنی مٹھاس تھی اور گیت کے بول اتنے میٹھے تھے کہ نند لال کے پاؤں تھم گئے۔ گیت کی آخری بند نے اُسی کے دل کو چھو لیا۔ وہ سوچنے لگا۔ "شادی کے وقت ہر نوجوان لڑکی کی یہی تمنا کیوں ہوتی ہے؟ کہ اُسے شری رام چندر جیسا خوبصورت پتی ملے۔ کوشلیا جیسی ساس ملے؟ شاید اسی لیئے بھولے بھالے لوگ اپنی بیٹیوں کے نام جنک دُلاری۔ جانکی یا سیتا رکھتے ہیں۔

سیتا۔ اِس نام کے تصوّر کے ساتھ ہی اُس کی بھانج کی سہیلی اپنی محلہ کی سیتا اُس کے دماغ میں آبسی۔ اُس نے سوچا۔ اِس کے ماں باپ نے بھی ایسی بات سوچ کر ہی اِس کا نام سیتا رکھا ہوگا۔ لیکن بیٹیوں کے ایسے نام رکھنے والے سادہ لوح والدین یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ اجودھیا کے رام چندر جی سے شادی کر لینے پر بھی رامائن کی سیتا کتنی دیر تک راج گدّی پر بیٹھ کر حکم چلا سکی تھی؟ چودہ برس کا بن باس اور اُس میں ایک سال بھر لنکا کے راجہ راون کی قید میں رہنے اور بے حساب مصائب برداشت کرنے کے بعد جب اجودھیا واپس آئی تو ایک ادنےٰ دھوبی کے زہریلے الفاظ نے اُس ابھاگن کو دوبارہ جنگلوں میں دھکیل دیا تھا۔"

نند لال کو یوں محسوس ہوا کہ آج کوئی نئی بات اُس کی سمجھ میں آئی ہے۔ " اپنے محلے کی یہ سیتا حُسن و جمال اور تریا ہٹ، کی اُس سیتا سے کم نہ تھی۔ گویا یہ سیتا بھی حُسن کے غنچوں میں سے ہی نمودار ہوئی ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ عورت بھی کیا بلا ہے۔ اِسی

غربت اور بے سرو سامانی میں بھی اُس کا کتنا دبدبہ ہے۔ کتنا چرچا ہے اُس کا محلہ بھر میں۔ پھر قسمت کا مذاق دیکھئے۔۔۔ کہاں یہ سیتا اور کہاں اُس کا خبطی۔ سادہ لوح۔ بھونڈا خاوند۔ لبھو۔ ــــــ اچھا کنہیا ور پیارا بچپارہ کو۔ جس کی شکل و صورت دیکھ کر ہی بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔۔۔ کہاں رام چندر اور کہاں اُلو بک لبھو!

قدرت مذاق بھی کرتا ہے تو کیسے پیس بھرے۔۔۔۔ اُدھر سیتا اور رام چندر اور اِدھر سیتا اور لبھو!۔ ناہ ایشور کیا خوب لیلا ہے تیری۔ ذرا۔۔۔۔۔۔ ساری رامائن پڑھ جایئے۔ آپ کو لبھو جیسا ایک بھی کردار کہیں نظر نہ آئے گا۔"

نند لال حیران تھا کہ آخر یہ جوڑی بنی کیسے ہوگی؟ سیتا کے والدین کو ایسی کون سی مجبوری آ پڑی ہوگی کہ پریوں کی طرح چنچل اور حسین بیٹی کو اُس اُلو بک کے پلے باندھ دیا؟ قربان جایئے لبھو کی تقدیر پر!

نند لال کے خیالات کا تانتا ٹوٹا تو اُس نے دیکھا کہ وہ تو سیتا کے مکان کے پاس آ پہنچا ہے۔۔۔ بڑی کشادہ ڈیوڑھی۔ سیڑھی کے تین۔ چار پائے اُترنے کے بعد کھلا صحن اور صحن کے ایک سرے پر ایک کشادہ سا کمرہ۔ سامنے سیتا دری پر بیٹھی مشین پر کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ نند لال کو دیکھ کر اس نے مشین روک لی۔ اور مسکرا کر بولی۔ "شکر ہے دیور جی! آپ کو بھی بیچاری سیتا کا خیال آیا ــــــ نہ۔ نہ دری پر کیوں بیٹھتے ہیں۔ یہ کرسی جو پڑی ہے

آپ کو میری قسم لگے!"

"آج تیرے ساتھ لڑنے آیا ہوں بھابی!" نند لال نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے دیور جی!" سیتا کے منہ پر وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ مسکراتے مسکراتے اُس کے رخساروں پر جو "بھنور بال"⁽¹⁾ سی بنیں۔ نند لال کی نظریں اُن میں پھنس گئیں۔ گویا کوئی تیراک کسی گرداب میں پھنس گیا ہو۔

"بھابی! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تیرے بارے میں ہر روز یہ نئی نئی کہانیاں کیوں گھڑتا ہے؟ محلے میں اور بھی تو عورتیں ہیں۔ لیکن۔۔۔۔؟" کہتے کہتے نند لال رک گیا۔ وہ دکھی ہو رہا تھا۔

سیتا نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں دیور جی! محلے بھر میں میرے جیسی کوئی ہو بھی! لیکن ان کہانیوں پر آپ کو ملال کیوں ہوتا ہے؟ انسان کی کہانیاں تو بنتی۔ چھپتی ہی چاہئیں۔ وہ زندگی بھی کیا ہوئی۔ کہ پیدا ہوئے۔ جیسے۔ روئے اور چل دیئے۔ معلوم ایسی پھیکی زندگی کو لوگ زندگی ہی کیوں سمجھتے ہیں؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ انسان کی چرچا تو ہونا ہی چاہیئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا دیور جی! آپ اس پر ذرا غور کریں میں اتنی دیر میں "پھرکی" پر دھاگا لپیٹ لیتی ہوں!"

نیچے سے پھرکی نکال کر سیتا نے سلائی پر چڑھائی اور اُس پر دھاگا لپیٹنے لگی۔ ماسٹر نند لال اُس کی باتیں سن کر حیرت سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی وہ اُس کے خوبصورت بال دیکھتا۔ کبھی اُس کا

(۱) ۔ بھنورِ زنخداں

گودرا ما تھا۔ کبھی تیکھی ناک تو کبھی اُس کی ابرُوؤں کی پتلی ٹیڑھی کمانوں کو۔ جلدی جلدی مشین چلانے کی وجہ سے کچھ دھاگا پھرکی سے باہر لپٹ گیا تھا۔ اُلٹی مشین چلاکر سنیتا اُسے کھولنے لگی۔ اُس کے پتلے پتلے۔ لال۔ لال ہونٹوں پر مسکراہٹ اب بھی کھیل رہی تھی۔ دھاگا کھل جانے پر سنیتا نے نندلال کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ارے بھیا جی! آپ تو بیچ میں ہی گہری سوچ میں پڑ گئے"

"سوچ رہا ہوں بھابی! کہ لوگ اِن کہانیوں سے کتنا ڈرتے ہیں۔ اور ایک تم ہو کہ کہتی ہو کہ وہ زندگی۔ زندگی ہی نہیں جو کسی کہانی کا موضوع نہ بنے"

"جھوٹ تھوڑے ہی کہتی ہوں جی!۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ آپ نے میرے بارے میں کیا کچھ سُنا ہے؟۔ اب میری کیسی نئی کہانی لکھی جا رہی ہے؟" سنیتا پھر مسکرائی اور اُس کے رُخساروں کے بیچ وہ بھنوریاں پھر گہری ہو گئیں۔

"بھابی! تم یہ مکان ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتیں؟ کوئی اور مکان کرایہ پر نہیں مل سکتا کیا؟" نندلال نے بڑے سیانے ڈھنگ سے سمجھا دیا۔ وہ پھر سوچ میں ڈوب گیا ــــ اُس نے سنیتا کو کبھی کھل کر ہنستے نہیں دیکھا۔ شاید وہ جانتی ہے کہ اُس کے مسکرانے میں جو جادو ہے۔ وہ اُس کے ہنسنے میں نہیں ہے۔ اُسے یاد آیا ابھی کل ہی دو تین عورتیں اُس کی بھاوجہ کے پاس آکر سنیتا کی مسکراہٹ کا ہی چرچا کر رہی تھیں۔ وہ اُس وقت اپنے کمرے میں چلتے ہی رہا تھا۔ ایک عورت نے کہا تھا۔ ....

"یہ بھی اُس گستی کی چال ہے"۔ ایک گھونٹ پینے کے بعد ہی چونک کر اُس نے پیالہ تپائی پر رکھ دیا تھا۔ وہ یہ بس بھری باتیں سُنتے سُنتے اُسے غصہ آرہا تھا ـــــ دُوسری عورت نے تائید کرتے ہوئے کہا تھا۔ "اُس کے کھُل کر نہ ہنسنے میں بھی کوئی راز پنہاں ہوگا۔ میری بات یاد رکھنا بہن! رانڈ ہنسے کیسے ؟۔ اُس کا کوئی دانت ٹوٹا ہوا ہوگا۔ کوئی وہ ٹوٹا ہوا دانت دیکھ لے تو پریوں والے اِس حُسن پر داغ نہ لگ جائے ؟ ہی ۔ ہی ۔ ہی......"
اپنی بات پر وہ خود ہی ہنس پڑی ۔

تیسری عورت اور دُور کی کوڑی لائی۔ "نہیں نہیں۔ دانت اُس کے تو موتیوں جیسے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مُسکرانے سے اُس کی گالوں میں جو شرارتی "گُتیاں" پڑتی ہیں۔ کھُل کر ہنسنے میں شائد وہ نہ بن سکتی ہوں"۔ "بہن! نہ جانے ایشور کبھی کبھی حُسن اور بدقسمتی کو یکجا کیوں کر دیتا ہے ؟"۔ دوارکے کی ماں نے اُنگلیاں نچاتے ہوئے کہا۔ "صورت دیکھ کر یُوں لگتا ہے کہ کوئی شہزادی ہے لیکن ....."

ایک اور عورت نے پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا۔ "گالوں کی اِن گُدیوں میں نہ جانے آج تک کتنے نوآموز اور مشاق تیراک ڈوب چکے ہیں۔ اِس شروپ نکھا کا کوئی کسی دن ناک۔ کان نہ کاٹا تو میرا نام بدل دینا"۔ دوارکے کی ماں کو یہ بات سُن کر مزا تو آیا لیکن اُسے یقین نہ تھا۔ کہ یہ تمنا برآئے گی۔ وہ مایوس ہوکر بولی۔ "اِس کا خصم بیچارا ہے بُدبک۔ جاہل۔ ناک۔ اور کان اِس کے کون کاٹے گا ؟"۔

ایک عورت بولی۔ "پنڈت نانی جی! جس ڈاکٹر کے گھر رہتی ہے نا، آجکل اُس پر جادو چل رہی ہے"۔ لہجے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی یہ خبر پاتال سے لائی ہو۔ مگر دنا آر کر کی ماں کسی بات کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ کہنے لگی۔ "اری تو ڈر ڈر کے کیوں بولتی ہے؟ جو بات محلے بھر میں تشہیر ہو چکی ہو، اُسے چھپانے سے کیا حاصل؟۔ وہ موٹا ڈاکٹر بھی۔ کیا نام ہے اُس کا؟ جسودھا لال یا جسونند نندن۔ سر کے بال سفید ہوئے تو راس رچانے کا شوق چرایا ہے۔ ہاں جی! رادھا اُسے گھر بیٹھی کھوجتی آ پہنچی ہے۔ اس کرایہ داری کے پردہ میں یہ جانے کیا کیا تماشے ہو رہے ہیں۔ لیکن کل سارا شہر اِن دونوں پر نہ تھوکے تو کہنا"۔

"پنڈت نانی جی! سُنا ہے۔ اپنی گھر والی سے تو ڈاکٹر بولتا ہی نہیں وہ بے چاری اِس گستنی کی جان کو نہ روئے تو کیا کرے۔ جو اُس کی چھاتی پر مونگ دلنے آ پہنچی ہے۔ اور ڈاکٹر کے بچوں کا تو اور بھی بُرا حال ہے۔ بچارے کیسے سہمے سہمے سے رہتے ہیں۔ دیکھا قسمت کا کھیل ماں باپ کے جیتے جی یتیم ہو جانا اِسے ہی کہتے ہیں!۔ اِس ڈائن کو اس محلہ سے نکلنا تو ہے لیکن کئی گھر تباہ کر کے...." پہلی عورت نے یوں اپنے دل کا غبار نکالا تھا۔

"پھر کیسی سوچ میں پڑ گئے دیور جی؟۔ اِس کچی عمر میں اگر اتنی گہری سوچ میں پڑنے لگے۔ تو آپ کا چہرہ پیلا پڑ جائے گا۔ پرمیشر نے یہ سوچ بھی کیسی منحوس چیز بنائی ہے۔ جوانی کی دشمن ہنسی خوشی کے لئے زہر قاتل ——— کیا کہہ رہے تھے آپ؟۔

لہ۔ گستنی = آوارہ۔ بدچلن عورت

میں گھر کیوں تبدیلی نہیں کر لیتی ؟ ۔ آپ ہی لے چلیئے نا مجھے اپنے ہاں ! ۔ دے دینا ایک چھوٹا سا کمرہ کرائے پر ۔ ۔ ۔ ۔ تم جیسا مہربان محافظ بھی مجھے مل جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " کہتے کہتے سیتا مسکرا دی ۔

" اپنا ہوتا تو تمہیں لے ہی جاتا بھابی ! ۔ لیکن وہاں تو میں خود بھی ایک کرایہ دار سا ہی ہوں ۔ ساٹھ ستر روپے مہاجن صاحب کی ہتھیلی پر رکھ کر دن گزار رہا ہوں " اتنا کہہ چکنے پر نند لال نے سوچا ۔ اگر " اس کا اپنا مکان ہوتا تو سچ مچ ایک دن کے لئے بھی سیتا کو اس لنکا میں نہ رہنے دیتا ۔

" تمہارا اپنا مکان ہوتا تو تم مجھے ضرور وہاں لے جاتے ؟ " سچ " نند لال کھو گیا ۔ یہ سچ اس طرح گونجا جیسے سیڑھیوں پر سے لڑھکتی ہوئی کانسے کی تھالی سن سن ۔ ۔ ۔ ن ۔ ۔ ۔ ن ۔ ۔ ۔ کر رہی ہو ۔ آدمی کے نفس کی گہرائی کتنی دور تک چلی جاتی ہے !

" لیکن دیور ! تم مجھے اپنے گھر لے کیوں جاتے ہو ۔ اس لئے کہ تم کو مجھ پر ترس آتا ہے ؟ ۔ یا اس لئے کہ تم کو یقین ہے کہ لوگ میرے متعلق جو باتیں کرتے ہیں ۔ وہ جھوٹی ہیں ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا ۔ ۔ ۔ یا پھر کوئی اور بات ہے ؟ " سیتا نے مسکراتے مسکراتے پوچھا اور قمیض کی آستین میں آستر ڈالنے کیلئے لٹھے کی کترن کاٹنے لگی ۔ نند لال بیچارا ! پھر گہری سوچ میں پڑ گیا ۔ " کیسے بیہودہ سوال پوچھ رہی ہے یہ عورت ! ۔ کیا جواب ہو سکتا ہے ان کا ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ترس آنے والی بات بھی ٹھیک ہے ۔ یہ بیچاری نوجوان محنتی عورت ہے ۔ لوگوں کے کپڑے سی سی کر اپنا ۔ اپنے احمق خاوند کا اور اپنے اکلوتے بیٹے کا گزارہ

چھلا رہی ہے۔ ایسی عورت پر بھلا ترس کیوں نہ آئے ؟۔ رہی لوگوں میں پھیلی اس کی بدنامی —— لیکن اس کے پاس بیٹھ کر۔ اس سے دو باتیں کر لینے کے بعد دل مانتا ہی نہیں کہ یہ بُری عورت ہے۔ دراصل اس کا حُسن ہی اس کا دشمن ہے"۔ اُس نے آگے سوچا۔ حسد رشک اور کینہ عورت کے خون میں گھلا ہوتا ہے۔ محلے کی عورتیں اس کو دیکھ دیکھ کر جلتی ہیں اور اس کی بدگوئی کر کے اپنے ہی دل کا غبار نکالتی ہیں —— یہ بیچاری بُری نہیں۔ اسے جان بوجھ کر بدنام کیا جا رہا ہے —— کہاں ہے اس کی آنکھوں میں وہ میل ؟ کہاں ہے اس کی مسکراہٹ میں وہ زہر ؟۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان دو باتوں کے علاوہ کوئی تیسری بات بھی ہو سکتی ہے بھلا ؟" نندلال نے اپنے ہی دل سے پوچھا۔

سیتا اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی نندلال کو کپکپی سی محسوس ہوئی۔ سیتا نے نظریں جھکا لیں۔ نندلال اُسے دیکھتا رہا۔ اُسے محسوس ہوا۔ کہ اس کا دل دھڑک رہا ہے۔

"تینوں میں سے کون سی بات ٹھیک جچتی ہے آپ کو دیور جی ؟"۔ سیتا نے نظریں اُٹھا کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تینوں بھابی !" نندلال کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"تینوں ؟۔ تو تیسری بات بھی کوئی ہے دیور جی"۔ مسکراتے مسکراتے پوچھا سیتا۔ نندلال کے خیالات کی گہرائی ناپنے لگی۔ نندلال خود حیران تھا کہ اس نے یہ کیا جواب دے دیا ہے۔ سیتا اُس کی پریشانی بھانپ گئی اور بات ٹالنے کیلئے مشین چلانے میں مصروف ہو گئی۔

نند لال سیتا کا سگا دیور نہیں ہے۔ ڈاکٹر جسو دھا نندن کے ہاں سیتا نے کمرہ کرایہ پر لیا تو سب سے پہلے اس کی واقفیت نند لال کی بھاوج سے ہی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ دونوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ سیتا کا سلائی کا کام چلانے میں نند لال کی بھاوج نے کافی مدد دی تھی۔ اس لئے سیتا اس کی احسان مند تھی۔ اپنی بھاوج کی معرفت ہی نند لال سیتا سے متعارف ہوا تھا۔ اور اُسے "بھابی" کہہ کر بلانے لگا تھا۔

نند لال کسی پرائیویٹ سکول میں پڑھاتا ہے۔ اُس کا بڑا بھائی اندیشر کسی مِل میں ملازم ہے۔ والدین کا سایہ اُٹھ جانے کی وجہ سے نند لال کی پرورش اُس کی بھاوج نے ہی کی تھی۔ اس لئے وہ اُسے والدہ کی بجائے سمجھتا ہے اور اُس کی ویسی ہی تعظیم کرتا ہے نند لال کو اس بات سے بڑی چڑھ لگتی ہے۔ کہ اب اُن ہی کے گھر میں عورتوں کا ست سنگ لگتا ہے۔ جس میں بھجن کیرتن کے علاوہ سیتا کی بُرائی بھی کی جاتی ہے۔ عورتوں کی باتیں سُن سُن کر اُس کی بھاوج بھی اب سیتا کے بارے میں شش و پنج میں پڑ گئی ہے۔

"یہ عورتیں کہاں کہاں سے کھوج لگاتی ہیں۔ ایسی ایسی باتیں" نند لال حیران ہو کر سوچ رہا تھا۔ "دوسرے گھروں میں کبھی سیتا کی اسی طرح بُرائی کی جاتی ہوگی؟۔ لیکن سیتا کی یہ مسکراہٹ! جب کبھی اُس نے محلے بھر میں پھیلی اُس کی بدنامی کا تذکرہ کیا۔ تو دیکھا کہ وہ نہ گھبرائی اور نہ ہی اُس کے چہرہ پر پریشانی کی کوئی شکن ہی دکھائی دی۔ مُسکرا کر وہ بس اتنا ہی پوچھتی۔ "اور کیا کچھ کہتے ہیں یہ لوگ؟

بُوٹ کی آہٹ سُن کر سیتا کی نگاہ صحن کی طرف گئی۔ اُس نے دیکھا۔ ڈاکٹر جسودھا نندن صحن میں آکر تھوڑے رُکے اور پھر دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کوٹ۔ نکٹائی کھولتے ہوئے اُنہوں نے سیتا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ کُرسی پر بیٹھے نند لال کی پیٹھ ہی انہیں دکھائی دے رہی تھی۔ سفید کُرتہ۔ دھوتی اور چپل پہن کر وہ سیتا کے دروازے کے پاس آ کھڑے ہوئے اور پُوچھنے لگے۔

"اب لال کی طبیعت کیسی ہے؟ اب کہاں ہے وہ؟"

سیتا نے جواب دیا۔" آج وہ کھیلنے گیا ہے ڈاکٹر جی! آپ نے اُسے اجازت جو دے دی تھی"۔

نند لال نے کُرسی پر سے کھڑے ہوکر ڈاکٹر صاحب کو نمستے کی۔ جوانی نے بڑھاپے کا ادب کیا۔ بڑھاپا خوش ہوگیا۔

"یہ کون صاحب ہیں سیتا؟"

"میرے دلبر ہیں ڈاکٹر جی!"

"اچھا۔ اچھا۔ دلبر بجا بی کی میٹھی باتوں میں تیسرے آدمی کو دخل دینے کا کیا حق ہے! کیا نام ہے ان کا؟"

"نند لال"

"بہت خوب! بہت خوب!! ۔ ضروری نہیں کہ سیتا کے دلبر کا نام بھرت یا لچھمن ہی ہو ——" ڈاکٹر صاحب نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور چلے گئے۔ اُن کی چپل کی آواز مدھم ہوئی تو سیتا بولی۔ "نند لال جی یہی ہیں ڈاکٹر جسودھا نندن۔ جن پر میں نے آجکل جادو کیا ہُوا ہے

دیکھا نا۔ کس طرح لٹو ہیں مجھ پر !۔ اِن ہی کے بارے میں شک کر
تم مجھ سے لڑنے آئے تھے نا؟ دیور جی !۔ میرے لال کی جان
اِسی دیوتا نے بچائی ہے۔ اُسے نمونیا ہو گیا تھا۔ لال کے پتا جی کو
تم نے دیکھا ہی ہے۔ کس رتبے کے مالک ہیں بچارے ؟۔ اپنے
رسوخ سے ڈاکٹر صاحب نے انہیں کسی بزاز کی دوکان پر نوکری دلائی
ہے۔ اِن کا یہ کمرہ کرایہ پر لے کر کس قدر سُکھی اور بے فکر ہوں۔ کیا
بتاؤں !۔ محلے کے منچلے گبرو اِن کے ڈر سے کپڑے سلانے کے بہانے
بھی میرے پاس نہیں آ سکتے۔ کیا یہ سب معمولی باتیں ہیں ؟"۔ ایک
ہی سانس میں اتنا کچھ کہہ کر سیتا مسکرا اُٹھی۔

"لیکن بھابی ! عورتیں کہتی ہیں کہ یہ ڈاکٹر تو قصائیوں سے
بھی زیادہ ظالم ہے۔ اپنی بیوی سے بولتا تک نہیں۔ اس کے بچے اس کے
سامنے تھر تھر کانپتے ہیں"۔ نند لال نے اپنی بدگمانی کو بے نقاب کرتے
ہوئے کہا۔

"کسی کے دل کی کوئی کیا جانے دیور جی !۔ لیکن میں نے سُنا ہے کہ
منجھلا لڑکا ڈاکٹر کو بہت عزیز تھا۔ لیکن وہ ڈوب کر مر گیا۔ باقی دو لڑکے
پڑھائی میں ناکارہ اور بگڑے ہوئے ہیں۔ اِس لئے ڈاکٹر اُن پر کُڑھتا ہے۔
اِس کی بیوی بیچاری کو ایک تو بیٹے کا صدمہ۔ دوسرے جوڑوں کا درد۔ وہ
اپنے گھر کے کام کاج میں لگی رہتی ہے۔ کہیں باہر نہیں جاتی۔ ایسے
گھریلو حالات میں ہر کوئی پریشان رہتا ہے۔ ۔ ۔ لوگوں کی سوجھ بوجھ
بھی انوکھی ہے۔ انہیں نہ کسی کا ہنسنا۔ مسکرانا پسند آتا ہے نہ رونا
برداشت ہوتا ہے"۔ سیتا مسکرائی اور اس کے چہرے پر وہی پہلی چمک

آ گئی۔ نندلال مست ہو کر یہ دُھوپ چھاؤں دیکھ رہا تھا۔

"دیکھیے ایک بات بتاؤں دیور جی!" نندلال کو اپنی طرف ہی گھورتے دیکھ کر سیتا نے کہا۔ "مردوں اور عورتوں میں ایک نمایاں فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھیے۔ مجھ پر انہیں لاکھ ترس آتا ہے۔ لالی کی بیماری کے دِنوں میں ہر روز دو۔تین بار اُسے دیکھنے بھی آیا کرتے تھے۔ لیکن دوائی کی قیمت تو انہوں نے مانگ کر بھی لے لی تھی اور کمرہ کے کرایہ کے بارہ میں اُن کی تاکید ہے۔ کہ ہر ماہ کی چوتھی تاریخ تک ادا ہو جانا چاہیئے۔

"اور اپنی طرف ہی دیکھیے۔ تمہیں مجھ پر ترس آتا ہے۔ تمہارا اپنا مکان ہوتا تو ایک آدھ کمرہ کرایہ پر یا شاید بِلا کرایہ ہی مجھے دے دیتے لیکن اپنے پاجامہ۔ قمیض آپ نے کبھی مجھے سینے کے لئے نہیں دیئے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

"قمیض۔ پاجامہ؟ وہ تو میں پہنتا ہی نہیں بھابی۔" نندلال نے گھبرائے ہوئے جواب دیا۔

"اگر پہنا کرتے تو بھی آپ مجھے سینے کے لئے نہ دیتے یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا گذارہ اِسی مشین پر ہے۔۔۔ ہے نا؟۔۔ دوسری طرف یہ عورتیں ہیں۔ چوری۔ چھپے میری لاکھ بدنامی۔ بدگوئی کرتی ہیں۔ لیکن ان کی ہی بدولت دیکھیے نا، میرے پاس کام کی کتنی بھرمار ہے۔ دن رات مشین چلاتی ہوں۔ پھر بھی کام نہیں نپٹتا۔" سیتا نے ایک حقیقت واضح کرتے ہوئے کہا:

"تمہارے ہاتھوں میں صفائی جو ہے بھابی اور بھ
اُجرت بھی بازار سے کم لیتی ہو"۔ نند لال نے صفائی شیتے ہوئے کہ
سیتا کو اپنی بات واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی
اُس نے کہا۔ "یہ بات نہیں دیور جی!۔ چار پیسوں کی بچت کی
وجہ سے یہ کام مجھے نہیں ملتا۔ بلکہ یہ کام مجھے دیکھنے کے بہانے
ملتا ہے۔ میں تو کہیں آتی جاتی نہیں۔ جو بے چاری میری
کہانیاں سُنتی ہیں۔ مجھے دیکھنے چلی آتی ہے۔ لیکن خالی ہاتھ
بہانہ لے کر آئے۔ اِس لئے سِلانے کے لئے دو۔ چار کپڑے
ضرور ساتھ لے آتی ہے۔ وہ شروع شروع میں مجھے گھور گھو
کر دیکھتی اور تولتی ہے اور پھر میری ہمدرد اور سہیلی بن جا
ہے۔ میرے بارے میں جو کچھ بھی سُنتی ہے مجھے سُنا جاتی ہے
میں کیسے کہوں کہ یہ عورتیں بُری ہیں؟ میری لاکھ بُرائی کریں لیک
میری پرورش بھی تو وہی کرتی ہیں۔ کیوں جھوٹ ہے؟"۔ دیو
کی طرف دیکھ کر سیتا مُسکرائی۔ نند لال بھی اُسے بغور دیکھ
رہا تھا۔

"دیور جی!۔ میں اِس بدنامی سے نہیں ڈرتی۔ مجھے
یہ ہے کہ جس دن میں اِن عورتوں سے ہِل مِل گئی اُسی د
سے میرا یہ کام۔ دھندا کم ہو جائے گا۔ اِن کا ساتھ دی
کے لئے مجھے مندر۔ شوالے جانا پڑے گا۔ ست سنگ
بھی وہ مجھے گھسیٹیں گی۔ تب کام کرنے کی فرصت ہی کہاں
گی مجھے؟۔ اِس لئے اِن بھولی۔ بھالی عورتوں سے اپنے موجودہ تع

مجھے بہت راس آ رہے ہیں۔ یہ بدنامی مجھے بڑی آرام دہ گھنی۔ ٹھنڈی چھاؤں دے رہی ہے۔ اس بدنامی کی سرپرستی میں میرا کنبہ پرورش پا رہا ہے۔ سچ مانو ردیور جی! میں بہت خوش اور بے فکر ہوں ——"۔

نند لال کی نظریں آہٹ پا کر پیچھے مڑ گئیں۔ اس نے دیکھا۔ کہ دو عورتیں سلائی کے لئے کپڑے لئے صحن میں آ پہنچی ہیں۔ وہ کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔

"اچھا بھابی! میں چلتا ہوں"۔ کہہ کر وہ کمرے سے باہر آیا۔ تو دیکھا۔ کہ دونوں عورتیں گھور گھور کر اسے دیکھ رہی ہیں۔ ایک نے آنکھ کے اشارے سے پوچھا۔ "ارے یہ کون ہے؟" دوسری نے ہونٹ پچکا کر گردن کو ذرا سا جھٹکا دیا۔ گویا کہہ رہی ہو "جانے میری بلا!"۔ پھر مسکراتی ہوئی سیتا کے پاس ہی وہ دری پر بیٹھ گئیں۔

پہاڑی کوّا

(مدن موہن شرما)

اُس کا اصلی نام گُجرو تھا۔ لیکن بچے۔ بوڑھے سب اُسے "پہاڑی کوّا" کہہ کر پکارتے تھے۔ اوّلاً یہ لقب اُسے پُورنی نے دیا تھا۔ اِس کی کئی وجوہات تھیں۔ پہاڑی اِس لئے کہ وہ سُدھ مہادیو کے دُور دراز پہاڑی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اور کوّا یُوں کہ وہ بڑا باتونی تھا۔ کوّے کی سی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اِدھر اُدھر گھما کر وہ اپنی پہاڑی بولی میں باتیں کرتا ہی چلا جاتا تھا۔

ہمارے گھر وہ دو وقت دُودھ دینے آیا کرتا تھا صبح اور شام صبح ابھی سب سوئے ہوتے کہ ہماری ڈیوڑھی کی کنڈی کھٹکنا شروع ہو جاتی۔ بیچاری پُورنی نیند بھری آنکھیں ملتی اور غصہ میں دانت پیستی اُٹھ کھڑی ہوتی۔ اور "کائیں۔ کائیں" کرتا۔ قہقہے لگاتا۔ اِدھر اُدھر کی ہانکتا گُجرو اندر آجاتا۔ وہ چار باتیں پُورنی سے کرنے کے بعد دُودھ کی ڈولچی اُسے دے دیتا اور پھر ماں جی کے کمرے کے کواڑ کھٹکھٹاتا۔ "اُٹھو ماں جی! دن چڑھ آیا ہے"۔ ہماری ماں جی

مسکراتی ہوئی اور میٹھی۔ معصوم گالیوں کا پرساد اسے دیتی ہوئی دروازہ کھول دیتیں۔

"صبح صبح تیرے متھے لگتی ہوں اور پھر سارا دن رونے پیٹنے ہی گذرتا ہے۔ پیرے پڑٹ منحوس ..."

یہ سن کر وہ زور سے قہقہہ لگا کر کہتا۔ "جھوٹ! ماں جی جھوٹ!! - پورنی سے پوچھو تو - صبح صبح میرا چاند جیسا منہ دیکھ کر وہ دن پھر کیسی خوش رہتی ہے"۔

اور پورنی ؟ - وہ غصہ سے تمتماتی رسوئی گھر سے باہر نکلتی ہے "ہاں تیرا منہ چاند سا ہی ہے۔ لیکن اماوس کا چاند۔ صبح سے شام تک کتر کتر چلتی تیری زبان تھکتی ہی نہیں۔ ہر دنت کا دُمس کائیں۔ سہپاڑی کوا کہیں کا ..."۔ پورنی کی بات سن کر وہ زور سے قہقہہ لگاتا۔ جس سے گھر کے سب لوگ جاگ پڑتے۔ بچے اپنے بستروں پر ہی "پہاڑی کوا" "لپھاڑی کوا" چلانے لگتے اور دوڑ کر اس سے لپٹ جاتے۔

صبح پانچ بجے کا آیا وہ چھ - ساڑھے چھ بجے ہمارے گھر سے جاتا۔ ماں جی جھڑکتے ہوئے کہتیں۔ " نگوڑے تو اتنی دیر تک ہمارے ہاں ہی بیٹھا رہتا ہے۔ دوسرے گھروں میں دودھ کب پہنچاتا ہوگا؟"۔ وہ دودھ کی خالی ڈولچی اٹھاتا۔ اور مسکراتی نظروں سے پورنی کی طرف دیکھتا دیکھتا چلا جاتا اور پورنی کا منہ لال ہو جاتا۔ حیا سے یا غصے سے ؟۔ کون جانے۔

گجرو کی عمر پچیس ۲۵ برس کے قریب ہوگی۔ خشخاشی بال۔ گاڑھے کھدر کا لمبا کرتہ زیب تن اور کانوں میں سونے کی چھوٹی

چھوٹی مُنڈریاں۔ اُس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور شرارت سے بھری تھیں۔ دیکھنے میں بڑا خوبصورت تھا۔ ہمارے بھائی صاحب پورنی کو چڑانے کے لئے کبھی کبھی کہہ دیتے۔ "پورنی! اگر تیری شادی گجرو سے ہو جائے تو کیا ہے؟"

"تو ؟" پورنی مٹھیاں کس کر کہتی۔ "تو میں اُس پہاڑی کوے کی گردن مروڑ کر چبا جاؤں"۔

"ارے رام! تو تو راکھشنی ہے راکھشنی!" بھائی صاحب ہنستے ہنستے کہتے اور بھابی جی آتے چھیڑنے کی غرض سے کہتیں۔ "اندر اندر سے تو اُس پر ریجھتی ہے لیکن ظاہرا طور پر نخرے کرتی ہے۔"

"میں اُس پر مرتی ہوں؟ اُس پہاڑی کوے پر؟" بھابی جی کی طرف گھورتی ہوئی پورنی کہتی۔ "دھرم سے کہتی ہوں۔ ایسے آدمی کو تو ہم اپنی جوتی بھی نہ چھونے دیں"۔

بھابی جی ہنس پڑتیں۔ "کیا کہنے تمہاری جوتی کے!"

پورنی اپنی جوتیاں اُس آدمی کو چھونے دیتی یا نہیں۔ یہ کون جانے لیکن ہماری ماں جی اپنے پہلے نوکر کرشن چند کے مرتے وقت کے یہ الفاظ ابھی نہ بھولی تھیں۔ "ماں جی! میں تو جا رہا ہوں۔ یہ انجان لڑکی (پورنی) آپ کے حوالے ہے۔ اِسے پالنے۔ بیاہنے کا کام اب آپ کے ہی ذمہ ہے"۔

اب پورنی جوان ہو چکی تھی۔ ماں جی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سال۔ چھ مہینے تک پورنی کی شادی گجرو سے کر کے اپنے دھرم اور اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گی۔ جب کبھی وہ گجرو کے بارے میں

پوہتی کی ایسی تیز باتیں سُنتیں تو اُسے جھڑک دیتیں۔ "ایسی اناپ شناپ مت بکا کر! تقدیر اور سنجوگ کا کیا پتہ۔"

کبھی کبھی شام کو گجرو اپنے ساتھ الغوزے لے آتا۔ تو بھائی صاحب اُسے اپنی چارپائی پہ بٹھا کر اس سے پہاڑی ترلے سنتے۔ گجرو کبھی کبھی لمبی میٹھی لے میں پہاڑی گیت گاتا ـــــ

"ہو بچھی اے ٹھکڑو کی آں چڑھاں۔۔۔۔"

"کیا سناؤں شاہ جی!" وہ اداس ہو کر کہتا۔ "میرا گھر سُندر ہمالیہ کے پہاڑی علاقے میں ہے۔ سرسبز پہاڑ اور پہاڑوں پر چھائی اُودی اُودی کالی گھٹائیں۔۔۔۔۔ ہے شاہ جی! میرا گھر جنت میں ہے۔ مگر کیا عرض کروں شاہ جی۔ اُس جنت میں غریبی بہت ہے۔ سرسبز پہاڑ ہیں ٹھنڈی ہوائیں اور ٹھنڈا پانی تو دیتے ہیں مگر مکئی کی روٹی (ٹھوڈے) نہاں کم ہے۔ اس لیئے میرے جیسے کئی غریب اور محنتی لوگ روٹی کی تلاش میں آپ کے شہروں میں چلے آتے ہیں۔"

یا اتنا کہہ کر گجرو خاموش ہو جاتا۔ وہ ماں جی کے سامنے سر جھکاتا۔ اور دودھ والی خالی ڈولچی لیکر اور اداس نظروں سے پوہتی کی طرف دیکھتا ہُوا چلا جاتا۔

ایک دن عجیب بات ہوئی۔ گجرو صبح دودھ دے گیا لیکن اُس نے آج ماں جی کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ صحن میں اُس کے قہقہے سنائی نہ دیئے۔ بچے کافی دن چڑھے تک سوئے رہے۔ ماں جی نے اپنا دروازہ کھول کر پوہتی سے پوچھا۔ "آج گجرو نہیں آیا کیا؟"

"آیا تھا۔ دودھ دے کر چلا گیا۔ آج وہ کچھ اداس۔ اداسی

دکھائی دیتا تھا ماں جی!"۔ پورنی بھی اُس دن اداس ہی رہی
شام کو وہ دودھ دینے آیا تو اُس کی آنکھیں بجھی بجھی سی
دکھائی دے رہی تھیں اور اُس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی
ماں جی نے پوچھا۔ "خیریت تو ہے گجرو"
"ہاں ماں جی!۔ ویسے تو خیریت ہی ہے۔۔۔۔۔۔"
اتنا کہہ کر وہ چلا گیا۔
دوسرے دن بھی ڈیوڑھی کی سانکل کی کھنکھناہٹ کسی
نے نہ سُنی اور پورنی کے سوائے اور کسی کو بھی اُس کے آنے جانے کی
خبر نہ ہوئی۔ پورنی نے ماں جی کو بتایا۔ "وہ بہت اداس ہے۔ مجھے کہہ
رہا تھا کہ تمہارے پاس پچاس روپے ہوں تو مجھے اُدھار دے دو۔
جلدی ہی واپس دے دوں گا"۔
"تم نے کیا جواب دیا؟"
"میں نے کہا۔ ماں جی سے پوچھوں گی"
شام کو جب وہ دودھ دینے آیا تو بارش ہو رہی تھی
اور ہم سب دالان میں انگیٹھی کے گرد بیٹھے تھے۔ ماں جی نے اُسے
پاس بٹھا کر پوچھا۔ "کیا ضرورت پڑ گئی ہے تجھے روپوں کی؟
کوئی خاص بات ہے تو بتاتا کیوں نہیں کم بخت؟"
پورنی بھی دروازے کی آڑ میں کھڑی تھی۔ گجرو تھوڑی دیر
خاموش رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "کیا بتاؤں۔ ماں جی! میں چار دن سے
سویا نہیں ہوں"۔
ہم نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں واقعی سوجی ہوئی تھیں۔ بڑے

غمگین لہجہ میں وہ کہہ رہا تھا۔ "میری رہائش گاہ (مکان) کے پاس ہی ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک تندوریا رہتا ہے۔ بے سہارا عیبی اور شرابی۔ وہ ہمارے پہاڑی علاقہ سے ایک سولہ سترہ برس کی لڑکی لے آیا ہے"۔ کہتے کہتے گجرو اور بھی اداس ہو گیا۔ "وہ کہتا ہے کہ یہ لڑکی وہ چار سو روپوؤں میں لایا ہے۔ ہر روز شام کو شراب پی کر وہ اُس لڑکی کو مارتا ہے۔ گویا وہ بیچاری انسان نہیں کوئی حیوان ہو۔ وہ بیچاری روتی۔ چلّاتی ہے۔۔۔۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ ماں جی! جیسے لڑکی نہیں میرے پہاڑ چلّا رہے ہیں رو رو کر فریاد کر رہے ہیں۔۔۔۔ میں جب بھی اُس لڑکی کو دیکھتا ہوں تو میرے دل پر چھریاں سی چلنے لگتی ہیں......"۔

ہم نے دیکھا کہ گجرو کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور گلے میں غم کے غبار اٹکے ہوئے معلوم پڑتے تھے۔

گجرو کہہ رہا تھا۔ "کل اُس لڑکی کا پھر سودا ہونے لگا تندور والا چار سو مانگتا تھا۔ لیکن گاہک تین سو ڈبل سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس لئے سودا رک گیا۔ ہو ماں جی! میرے پہاڑوں کی عزت تین۔ تین۔ چار۔ چار سو روپوؤں میں نیلام ہو رہی ہے"۔ گجرو نے تڑپتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر وہ پھر کہنے لگا۔ "مار کھاتی ہوئی وہ لڑکی سسک سسک کر اپنے باپو کو پکار رہی تھی۔۔۔۔۔ ماں جی! میں اُس کی درد بھری پکار سن نہیں سکتا۔۔۔۔ قسم شیو جی مہاراج کی! اگر میرے پاس پچاس روپے اور ہوں تو میں چار سو ڈبل اُس راکھشس کے

مُنہ پر پھینک کر اپنے پہاڑوں کی عزّت بچا لوں۔ اُس لڑکی کو اُس کے باپو کے پاس پہنچا آؤں۔ اُسے اُن سبزہ زار پہاڑوں میں پہنچا آؤں۔۔۔ جن کی پرچھائیاں وہ اُس قید خانے کی کھڑکی میں سے آسمان پر ڈھونڈ رہی ہے۔۔۔۔ دو سال کی کمائی کے ساڑھے تین سو (۳۵۰) روپے میرے پاس ہیں۔ کہیں سے پچاس روپے اور مل جاتے تو۔۔۔۔۔" گجرو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی

بھائی صاحب نے اُسے سمجھایا۔ "اس لڑکی کو اُس کے باپو کے پاس لے جانا بے سُود ہے۔ وہ اُسے کسی اور تنشدد لوبھی کے ہاتھ بیچ دیگا۔"

گجرو نے بھائی صاحب کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور لمبی سانس لے کر کہنے لگا۔ "آپ سچ کہتے ہیں شاہ جی! لیکن میں اُس بے چاری کا رونا پیٹنا نہیں سن سکتا۔" اتنا کہہ کر گجرو چلنے لگا۔ تو ماں جی نے اُسے بلایا اور پچاس روپے کر اُس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ نوٹ اُس کے ہاتھ میں کانپ رہے تھے اور مارے خوشی کے اُس کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ اُس نے صرف یہی کہا۔ "میں یہ جلد ہی واپس کر دوں گا۔ آپ کتنی اچھی ہیں ماں جی!"

وہ چلا گیا اور پورے تین سال لگا میں ڈیوڑھی تک اُس کا انتظار کرتی رہیں۔

دوسرے دن جب گجرو آیا تو اُس کے ساتھ سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ بڑی سہمی سہمی سی تھی۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اُس کا لمبا کُرتہ لال تھا۔ پاؤں میں پہاڑی جوتے اور کانوں کے کنڈل بتا رہے تھے کہ وہ کوئی پہاڑی لڑکی ہے وہ اس طرح ڈری ہوئی تھی جیسے کوئی پرندہ

شکاری کے پھندے میں آ پھنسا ہو۔

نجو نے ماں جی سے کہا۔ "آپ کو ایک تکلیف اور دیتا ہوں ماں جی! اسے آٹھ دس دن کے لئے اپنے پاس رکھنے کی کرپا کریں۔ میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اتنے دنوں میں مجھے تنخواہ مل جائے گی تب میں اسے بھابی سے باپو کے یہاں چھوڑ آؤں گا۔"

ماں جی نے پورنی کو بلایا اور اس لڑکی کو اپنے کمرے میں لے جانے کو کہا۔ پورنی نے پہلے انکار کیا لیکن ماں جی کے اصرار پر مان گئی۔

بھابی جی۔ کبھی کبھی لڑکی کو اپنے پاس بٹھاتیں۔ اس سے باتیں کرتیں لیکن وہ روتی ہی رہتی۔ تیسرے روز ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ پورنی نے دیپتی (لڑکی کا نام) کو نہلایا۔ اسے میلے کپڑے دھوئے اور اس کے بالوں میں بڑے چاؤ سے کنگھی کی۔ ہم حیران تھے کہ پورنی کی وہ تیوریاں آج کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں جو اس لڑکی کو دیکھتے ہی پہلے روز اس کے ماتھے پر ابھر آئی تھیں۔

اسی طرح ایک دن جب وہ اس لڑکی کو نہلا رہی تھی تو بھابی جی نے ہنستے ہنستے کہا۔ "اچھا ہو اگر نجو اس لڑکی سے شادی کر لے۔ دیکھنے میں بھی اچھی ہے اور ہے بھی اُسی کے پہاڑی ذات کی۔"

کتنی ہی دیر کے لئے بھابی کی طرف گھورتے ہوئے پورنی بڑبڑائی۔ "ہونہہ! شادی کر لے......" اور بات ادھوری چھوڑ کر ہی وہ دیپتی کا سر دھلانے لگ گئی۔ بھابی جی دن بھر پورنی کے اس "ہونہہ" کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں۔

تنخواہ ملنے پر گجرو اس لڑکی کو اُس کے باپ کو سونپنے چلا گیا
اس نے ڈیری سے پندرہ دنوں کی رخصت لی تھی۔ جانے سے پہلے پورنی
اور گجرو کے درمیان جو کھسر پھسر ہوئی تھی۔ اس کے متعلق لاکھ
پوچھنے پر بھی پورنی نے بھابی جی یا بھائی صاحب کو کچھ نہیں بتایا۔

گجرو کو گئے بارہ ۱۲ دن ہو گئے۔ اس کی باتیں یاد کر کر کے ہم
لوگ ہنستے رہتے۔ لیکن پورنی خاموش تھی اور اداس بھی۔ شام کو بھائی
صاحب گھر آتے تو وہ ان سے پوچھتی۔ "کوئی چٹھی آئی جی؟"۔

تیرہویں دن اس کی چٹھی آئی۔ لکھا تھا "گاؤں میں پہنچنے سے چار
دن پہلے ہی دھنتی کے والد کی شراب کے نشہ میں ایک چولہے پر سے گر
جلنے کی وجہ سے موت ہو چکی تھی۔ اب اس دنیا میں اس لڑکی کا اپنا کوئی
نہیں ہے۔ اب اسے یہاں اکیلے کس کے سہارے چھوڑ جاؤں؟
خیر! جیسی بھگوان کی مرضی۔ بہر حال کوئی نہ کوئی بندوبست کر کے میں
جلدی ہی واپس آ رہا ہوں۔ ماں جی کو چرن سپرش کہنا۔ اور پورنی کو کہہ دیں
کہ وہ چاہے مجھے پہاڑی گدھا کہے۔ لیکن میں تو اسے دیوی سمجھتا ہوں
دیوی! مجھے آپ کے گھر کا ہر فرد یاد آتا ہے"۔

چٹھی سن کر پورنی پہلے تو بہت خوش ہوئی۔ پھر اچانک
اداس ہو گئی۔ اور اپنے کمرے میں جا کر اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا
بھابی جی نے لاکھ پکارا۔ لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا۔ شام کو وہ
چائے لیکر آئی تو بھابی جی نے پوچھا۔ "تجھے کیا ہو گیا ہے پورنی؟"۔
تو تو گجرو کو اپنے جوتے سے بھی چھونا نہیں چاہتی تھی۔ اب
تیرا چہرہ اتنا کیوں اتر گیا ہے؟"

پورنی نے بھابی جی کو ایسی نظروں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہو "میں بہت جھوٹی ہوں"۔

ہوا کے جھونکوں کی طرح دن گزرتے گئے۔ گجرو کو گئے اب ڈیڑھ۔ دو مہینے ہو گئے۔ نہ وہ خود آیا نہ اُس کی کوئی اور چٹھی ہی آئی۔ ہم اُسے بھولنے لگے تھے۔ لیکن پورنی۔ بھائی صاحب سے اکثر پوچھتی رہتی۔ "کیا چٹھی آئی جی؟"

آخر اڑھائی مہینے بعد گجرو کی چٹھی آئی۔ اُس نے لکھا تھا "مہاراج! میں بڑے جھمیلے میں پھنس گیا ہوں۔ ونتی کو میں اپنے گھر لے تو آیا۔ لیکن گاؤں والوں نے ناک میں دم کر دیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اگر ونتی سے پوچھتا تو وہ کہتی میرا کوئی نہیں ہے۔ میں کہاں جاؤں؟'۔ میں تھوڑی دیر کیلئے پورنی کو بھول گیا۔۔۔ میں نے پنڈت کو بلا کر ونتی سے شادی کر لی۔ پورنی مجھے لاکھ گالیاں دے گی۔ آتی بار جو وعدے میں اس کے ساتھ کر آیا تھا۔ اُنہیں یاد کر کے وہ ضرور کہتی ہوگی۔ کہ میں مکّار ہوں۔ بے وفا۔ دغا باز ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہوں۔ مہربانی کر کے اُسے کہہ دیں۔ کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ میں سچ مچ "پہاڑی کوّا" ہوں۔۔۔۔ اپنے پہاڑوں سے اُڑ کر میں اُس کے باغ میں آیا۔ اُس کی زندگی کے ہرے بھرے شجر پر بیٹھنے ہی لگا تھا کہ میرے پہاڑوں نے مجھے واپس بلا لیا۔۔"

آخر میں اُس نے لکھا تھا۔ کہ وہ کمائی کر کے جلد ہی ماں جی کے پچاس روپے بھیج دے گا۔

پورنی نے تمام چٹھی سُنی سُن کر وہ چُپ چاپ اپنی کوٹھڑی

کے اندر چلی گئی اور اُس نے اندر سے کُنڈی چڑھالی۔ تمام رات اُس کے کواڑ بند رہے۔ ماں جی نے۔ بھابی جی نے اور بھائی صاحب نے لاکھ کوشش کی کہ وہ دروازہ کھولے۔ لیکن بے سُود تمام رات اُس کی کوٹھری میں اندھیرا چھایا رہا۔

صبح ماں جی نے پھر کوشش کی۔ کئی آوازیں دیں لیکن اُس نے نہ دروازہ کھولا اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیا۔ نہ رات کو کچھ کھایا تھا۔ نہ صبح ہی۔ انہیں خدشہ ہو گیا کہ اِس غمگین حالت میں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ کہ دوپہر کے وقت اُس نے اچانک دروازہ کھول دیا۔ ایک ہی رات میں اُس کی شکل و صورت بدل چکی تھی۔ چہرہ پیلا زرد۔ لگاتار رونے سے آنکھیں گُلِ انار کی مانند سُرخ! وہ باہر نکلی۔

منڈیر پر ماں جی نے رات کی باسی کھچڑی ڈال رکھی تھی ایک بڑا سا پہاڑی کوّا کھچڑی چونچ میں بھر رہا تھا۔ پورنی کو نہ معلوم کیا سُوجھی۔ اُس نے مٹی کا بڑا سا ڈھیلا اُٹھا کر کوّے کی طرف تاک کر پھینکا۔ کوّا کائیں۔ کائیں کرتا اُڑ گیا۔

———×———

از

دھرم چند پرشانت

چیچلو!

لیفٹیننٹ گیان جب اٹک کے کنارے جا کر کھڑا ہُوا تو اُس نے جو نظارہ دیکھا وہ غیر معمولی تھا۔ پونچھ میں تبادلہ ہو کر آئے اُسے ابھی تین ہی دن ہوئے تھے۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہاں ایک کٹاؤ کی وجہ سے دریا تک جانے کا راستہ سا بن گیا تھا کچھ چٹانیں ابھر آئی تھیں جن پر لوگ بیٹھ سکتے تھے۔

گیان نے دیکھا۔ اٹک ٹھاٹھیں مارتا بہہ رہا ہے دریا کی موجیں جب بلند ہوتیں تو یوں لگتا کہ چٹانیں ہی بہتی چلی جا رہی ہیں۔ دریا کا پانی اِس قدر ٹھنڈا تھا۔ کہ اُس سے چھو کر آنے والی ہوا اُس کے جسم میں کپکپی پیدا کر رہی تھی۔ آر پار کتنے ہی بھوٹیئے دریا میں بہتے آ رہے "بدھم" کے لٹھے پکڑ رہے تھے۔ پونچھ میں لوگوں کا یہی بڑا دھندا ہے۔ دن بھر میں آٹھ۔ دس آنے کی کمائی تو ہو ہی جاتی ہے۔

لیفٹیننٹ نے اپنی دائیں طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ لگ بھگ بیس۲۰ سال کی ایک دوشیزہ دریا کے کنارے بیٹھی تھی۔ اُس کے نیچے ایک چٹان تھی۔ جس کے ساتھ دریا کی موجیں ٹکرا رہی تھیں۔ چٹان نہ معلوم کب سے وہاں جمی پڑی تھی۔ لہریں اُس کے اِستقلال کو ہلا نہ سکی تھیں۔ لڑکی لہروں کی اِس چھیڑ چھاڑ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی ٹھوڑی کو ہتھیلی پر رکھے محو نظارہ تھی اور لیفٹیننٹ کی نِگاہیں اُس لڑکی پر اٹکی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی وہ سر بہ فلک نانگا پربت کو دیکھ لیتی تھی جو بڑی تمکنت سے کھڑا تھا۔ اُس کا بالائی حصہ برف سے لدا ہُوا تھا اور فلک بوس چوٹی بادلوں سے گھری ہوئی تھی۔ اہلِ بونجی کیلئے نانگا کی چوٹی کا دیدار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

گیان نے دیکھا کہ بادلوں کا پردہ ہٹا اور چوٹی دکھائی دی۔ اُس لڑکی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ اُچھل پڑی اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "جولے"! (نمسکار)

دریا کی لہر جب اُس چٹان سے ٹکرائی تو ہلکی سی پھوہار اُس لڑکی کے پاؤں پر بھی پڑتی تھی۔ گیان حیران تھا کہ لڑکی اس چٹان کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہے؟۔ اور بار۔ بار نانگا پربت کی طرف نگاہیں کیوں اُٹھاتی ہے؟"

گلگت میں اپنے دو سال کے قیام کے دوران اُس نے کبھی کسی عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ چھ ماہ وہ چیلاس گذار آیا۔ وہاں بھی اُسے کوئی عورت دکھائی نہ دی تھی۔ پھر بونجی کی چھاؤنی نے

اس قدر نزدیک یہ لڑکی کہاں سے آنکلی ؟ ۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے سنبھل کر بھوٹیا بولی میں پوچھا "چا یہ تنگ کا پا این؟" (تو کہاں رہتی ہے ؟)

ابھی تک اُس بھوٹیا لڑکی نے گیان کو نہیں دیکھا تھا۔ بات سُنتے ہی اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُس نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور آن کی آن میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ خوبانیوں کے باغ میں جا چھپی۔ لفٹینٹ کے جی میں آیا کہ اُس کا پیچھا کرے۔ لیکن چھاؤنی کے قانون نے اُسے تعاقب کرنے سے روک لیا۔

اگلے روز اُسی وقت وہ پھر اٹک کے کنارے جا پہنچا۔ لڑکی آج بھی وہاں بیٹھی تھی۔ وہ پہلے کی طرح دریا کی لہروں کو اور ننگا پربت کی چوٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گیان آہستہ آہستہ اُس کے پیچھے جا پہنچا۔ لیکن اُس کے بوٹ کی ٹھوکر سے کچھ کنکر نیچے لڑھک گئے۔ کھڑکھڑاہٹ سن کر وہ لڑکی بھاگنے لگی تو گیان نے اُس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ جھٹکا دے کر بولی۔ "چھوڑ" ۔ اور دیکھتے دیکھتے خوبانیوں کے باغ میں پھر گم ہو گئی۔ گیان سمجھ گیا۔ کہ باغ کے عقب میں جو مکان ہیں اُن ہی مکانوں میں سے کسی ایک میں وہ رہتی ہوگی۔ گیان ہر روز دریا پر جاتا۔ لیکن وہ لڑکی پھر وہاں نہ آئی۔

لیفٹننٹ گیان لوتھی میں "آفیسرز میس" کا انچارج تھا۔ اور 'میس' کے لانگری رخصت پر چلے گئے تھے اور سپاہیوں کا لانگری بھی لا حاصل تھا۔ گیان نے آج پھر کمپنی کمانڈر کو رپورٹ کی تھی۔ کرنل بھیشم سنگھ نے لیفٹننٹ کو بُلا کر کہا۔ "لانگری مل گیا ہے آپ اُسے

ساری بات سمجھا دیں گا"۔ گیان جب بیس میں گیا تو نئے انگریز کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہ وہی ٹھک کے کنارے والی لڑکی تھی۔ گیان کو دیکھ کر وہ لڑکی ہچکچائی۔ لیکن جلدی ہی سنبھل کر بولی۔ "سلام"!

گیان ہنس پڑا۔ "کیا تو ہمارا ہندوستانی بول لیتی ہے؟"

"ہاں"۔ کہہ کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر کہنے لگی۔ "بیس کے آپ ہی انچارج ہیں؟ مجھے ضروری باتیں سمجھا دیجئے"۔

گیان نے سب باتیں سمجھا کر ضروری سامان بھی اُسے دکھا دیا۔

وہ دیکھنے میں بھولی لیکن بڑی ہوشیار تھی۔ بہت جلد سب کچھ سمجھ گئی۔ آج اُس میں رتی بھر بھی جھجک نہیں تھی۔

گیان نے پوچھا۔ "تم مسلمان ہو؟"

"نہیں! بودھی"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"چن جان ڈو"

"تمہارا گھر کہاں ہے؟۔ گلگت؟"

سر ہلاتے ہوئے اُس نے جواب دیا۔ "نہیں۔ سکیانگ۔ ہم پندرہ سال سے گلگت میں رہ رہے ہیں"۔

لیفٹیننٹ نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارا نام لینا قدرے مشکل ہے۔ میں تجھے دوسری نام سے پکارا کروں گا۔ "چینچلو"

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ پھر کہنے لگی۔ "ٹھیک ہے!"

بھوٹنی کا نام چینچلو ہی پکا ہو گیا۔ کرنل صاحب بھی اُسے اسی نام سے پکارتے تھے۔ لیکن وہ کسی کے ساتھ کبھی ضرورت سے

زیادہ باتیں نہیں کرتی تھی گیان۔ چونکہ بیس کا آغاز تھا۔ اس سے البتہ وہ زیادہ گھل مل گئی۔ رات کو اگر کبھی کھانا کھلاتے کھلاتے اُسے دیر ہو جاتی تو وہ اُسے گھر تک چھوڑ آتا تھا۔ اب وہ اس سے بالکل نہ ڈرتی تھی۔ ایک دن اُس نے گیان سے کہا۔ "اس دن میں آپ سے بہت ڈر گئی تھی"۔ اور پھر ہنس پڑی۔

کبھی کبھی دونوں اکٹھے اٹک کے کنارے چلے جاتے تھے۔ اور چنیلو گھنٹوں چٹان سے ٹکراتی لہریں اور نانگا پربت کی چوٹی کی طرف دیکھتی رہتی۔ گیان نے کئی بار اس کی وجہ پوچھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ٹال جاتی۔ ایک دن گیان نے پھر اصرار کرتے ہوئے کہا۔ "تم جو ان لہروں اور اُس چوٹی کو اتنے غور سے دیکھتی رہتی ہو اس میں ضرور کوئی راز ہے"

چنیلو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "آپ کو اپنا سمجھ کر میں آپ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں گی۔ جس جگہ ہم بیٹھے ہیں یہاں ایک دن میں نے ایک آدمی کو اپنا دل دیا تھا"۔ قمیض کی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے اُس نے آگے کہا۔ "وہ گلگت ایجنسی کا ملازم تھا۔ یہیں بیٹھ کر اُس نے میرے ساتھ بہت سے قول و اقرار کئے تھے"۔

"اُس کا نام کیا ہے؟۔ اِس وقت وہ کہاں ہے؟" گیان نے پوچھا۔

"اُس کا نام نیک رام ہے اور آج کل وہ ایبٹ آباد میں رہتا ہے۔" چنیلو نے جواب میں کہا۔

"تو کیا اُس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے؟"

چینچلو نے اور زور سے روتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ مجھے دھوکہ دے گیا۔ لیکن میں آج تک اُسے نہیں بھولی ہوں۔" پھر اُس نے لیفٹیننٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "تمہیں مجھ سے نفرت ہو گئی ہوگی؟۔ اسی لئے تو ئیں بتاتی نہ تھی"۔

گیان نے چینچلو کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "نہیں پہلے سے بھی زیادہ ہمدردی ہو گئی ہے۔ اگر کہیں وہ مل جائے تو اُسے مار مار کر ادھ مرا کر دوں"۔ گیان نے اپنی بات کا ردِ عمل دیکھنے کے لئے چینچلو کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ لیکن کچھ حاصل نہ کر سکا۔ دونوں چپ چاپ میس میں لوٹ آئے۔

چینچلو ڈوگرے کھانے بہت اچھے بناتی تھی۔ بہت سی بھاجیاں بنانا گیان نے ہی اُسے سکھائی تھیں۔ گیان اور چینچلو کے اس میل ملاپ پر افسروں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک دن کرنل صاحب نے گیان کو بلا کر کہا تھا۔ "اگر میس کا انتظام آپ سے نہ ہو سکتا ہو تو میرے حوالہ کر دیجئے"۔

لیفٹیننٹ نے جوش دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ "پچھلے اڑھائی سالوں سے اس ایریا میں میس چلا رہا ہوں۔ اب اسے چھوڑ دینے والی کیا بات ہو گئی ہے کرنل صاحب؟"۔

"جوانی مُنہ زور ہوتی ہے نا۔ . . ."۔ بات ادھوری چھوڑ کر ہی کرنل صاحب باہر چلے گئے۔ گیان نے چپ چاپ سُن لیا۔ لیکن اُس نے کسی کی پرواہ نہ کی۔

لیفٹیننٹ گیان۔ چینچلو کے گھر بھی ایک دو بار ہو آیا تھا۔ چینچلو کی والدہ دو ماہ سے بیمار تھی۔ وہ گیان کو بہت چاہتی تھی۔ ایک دن اُس نے کہا تھا۔ "بیٹا! ہم بہت غریب ہیں۔ چن۔ چان لو کا باپ چار ماہ سے گرفتار ہُوا ہے۔ اس کی خیریت کی آج تک کوئی اطلاع نہیں آئی ہے۔ میں خود بیمار ہوں۔ ہمیں روٹی کے بھی لالے پڑے ہیں۔ اسی لئے لڑکی کو آپ کے میس میں بھیج رہی ہوں۔ ورنہ ہم لوگ تو سپاہیوں کے سائے سے بھی بچتے ہیں۔"

گیان نے بڑھیا کو تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔ چینچلو کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں خود اس کا ضامن ہوں۔"

ایک دن کھانا پکاتے کھلاتے چینچلو کو دیر تک رُکنا پڑا۔ رات بھی اندھیری تھی۔ اس لئے گیان ٹارچ لے کر اُسے گھر پہنچانے چلا۔ جب دونوں خوبانیوں کے باغ میں پہنچے تو کسی نے اندھیرے میں چینچلو کو زور سے جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑی اور گیان کے ہاتھ سے ٹارچ نیچے گر گئی۔ یوں معلوم ہُوا کہ جھٹکا دے کر کوئی بھاگ نکلا ہے۔ گیان نے ریوالور نکال کر اندھیرے میں فائر کر دیا۔ چینچلو گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور گیان سے لپٹ گئی۔ اُس کی چھاتی زور زور سے دھڑک رہی تھی۔

اُسے گھر پہنچا کر جب گیان واپس چلا تو چینچلو نے اُسے روک کر کہا۔ "اس وقت میں آپ کو نہ جانے دوں گی۔ پتہ نہیں وہ کون تھا؟ نہ جانے اُسے ہمارے ساتھ کیا دشمنی تھی؟"

گیان مسکرا کر کہنے لگا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں میرے ریوالور میں ابھی پانچ گولیاں باقی ہیں۔"

چینچلو اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ کر کہنے لگی۔ "اگر رات یہاں ہی رہ جاؤ تو حرج بھی کیا ہے؟" وہ شاید زیادہ ڈری ہوئی تھی۔

"ہم فوجی لوگ رات کو چھاؤنی سے باہر نہیں رہ سکتے۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔"

گیان چلا گیا۔ چینچلو نے دروازہ بند کر لیا۔ گیان رات بھر اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اگلے روز چینچلو دیر سے بیرک میں آئی۔ اُس کی لال۔ لال آنکھیں دیکھ کر گیان سمجھ گیا۔ کہ وہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ چینچلو نے گیان کے پاس آکر آہستہ سے کہا۔ "اُس آدمی کا پتہ چل گیا ہے۔ وہ وہی تھا"

"وہی کون؟"

"ننک رام"

"ننک رام؟۔ تم نے کیسے جانا؟" گیان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اُس کی لاش مَیں نے آتے آتے دیکھی ہے۔ لمبی لمبی گھاس میں پڑی تھی۔ میں نے اُس کے اوپر اور گھاس ڈال دی ہے۔ آج رات تو ہی اُسے ٹھکانا بُرد کرنا پڑے گا"

گیان گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اُس نے پچھتاتے ہوئے کہا۔ "چینچلو! تم نے بُرا تو نہیں مانا؟ مجھے کیا معلوم تھا۔ کہ وہ

نیک رام ہے"۔

چنچلو کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے جواب دیا۔ "آپ کا احسان میں عمر بھر نہ بھول سکوں گی"۔ اتنا کہہ کر وہ کام میں مصروف ہوگئی۔ رہ۔ رہ کر اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتیں۔

اندھیرا ہو گیا۔ گیان۔ چنچلو کو چھوڑنے چلا۔ چنچلو نے ایک طرف جا کر گھنی لمبی گھاس ہٹائی۔ نیک رام کی لاش وہاں پڑی تھی۔ چنچلو نے اُسے اٹھانے کا اشارہ کیا۔ لیفٹیننٹ نے اُسے پیٹھ پر لاد لیا۔ "اسے پرتاپ پل پر سے دریا بُرد کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں کنارے اٹک جائے"۔ چنچلو نے پھسپھساتے ہوئے کہا پل کافی دور تھا۔ لاش کو پل کے بیچ رکھ کر گیان سستانے لگا۔ چنچلو اُسے تھوڑا پیچھے لے جا کر کہنے لگی: "آپ یہاں آرام کریں۔ لاش کو میں پھینک آتی ہوں"۔ گیان بیٹھ گیا اور چنچلو جاتے جاتے اُس کا ہاتھ زور سے دباتی گئی۔ اُس نے لاش کو گھسیٹ کر اُس جگہ پہ رکھا جہاں پل کے ڈنڈے ٹوٹے ہوئے تھے پھر اُس نے لاش کو کھڑا کیا اور اُس سے لپٹ کر دریا میں کود پڑی۔ گیان دوڑا۔ مگر وہ دولہن اٹک کی لہروں میں سما چکی تھی اُس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کہ چنچلو نے یہ کیا کیا؟۔ وہ اپنے خیالات میں غرق چھاؤنی کو واپس چلا گیا۔

اگلے روز وہ اٹک کے اُسی کنارے پر کھڑا تھا۔ جہاں اُس نے پہلی بار چنچلو کو دیکھا تھا۔ اُس نے دیکھا ۔ کہ دریا کی لہریں اُسی طرح چٹان سے ٹکرا رہی تھیں۔ نانگا پربت کی چوٹی بھی دکھائی دے رہی

تھی۔ اَب اُسے معلوم ہُوا۔ کہ چنچلا اُس چٹان اور نانگا پربت کی طرف کیوں دیکھتی رہتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ایک حقیقت اُس پہ واضح ہوئی۔ کہ پیار چٹان کی طرح اٹل اور نانگا پربت کی مانند بلند ہے ؛

از
شری نریندر کھجوریہ

دِن بار

اُس کی شادی ہوئے ابھی سات ہی سال ہوئے تھے کہ بھاگاں بیوہ ہو گئی اور اس وقت بھاگاں کی عمر سترہ سال کی تھی۔ اُس کا ڈوم خاوند زمیندار کی بیگار پہ گھاس کاٹنے گیا تھا کہ وہیں ٹیلے پر سے لڑھک کر راہی عدم ہوا۔ بھاگاں اب اکیلی تھی۔ دوسرے دن صبح وہ گھونگھٹ نکالے وہ زمیندار کے آنگن میں بیٹھی تھی۔ سامنے کھاٹ پہ بیٹھے مالک حقہ پی رہے تھے۔

"اَن داتا! ڈوم کے "دِن بار" کرنے ہیں[1]"۔ بھاگاں نے زمین کریدتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"ہوں"۔ اَن داتا نے حقے کا دھواں ناک اور منہ سے ایک ساتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "تیرے خصم نے اپنے باپ کی وفات پر کریا کرم کرنے کیلئے جو روپیہ اُدھار لیا تھا۔ اُس کا 'تاوان' بھی ابھی نہ بھرا ہے۔ خیر۔ تو کسی دوسرے ڈوم کو دیکھ لے۔ اور کچھ نہیں۔

[1] دِن بار = ماتمی رسومات

کوئی بیٹا - بیٹا ہی ہو جائے گا ۔ تجھے راناڑ کو بھلا کیس بھرنے پر کھاتے پر چڑھایا جا سکتا ہے ؟ ۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟"

" ست بچن مالک !" ۔ گھونگھٹ میں سے مریل سی آواز آئی ۔

بہی پر بھاگاں کا انگوٹھا لگوا کر دس روپے دیتے ہوئے مالک نے کہا ۔ " سب ملا کر ستائیس ہوئے ۔ اندر ڈھور ڈنگر کیا ہے ۔ تمہارے پاس ؟ ۔ سُود ۔ بیاج ساتھ ۔ ساتھ چکتا جائے تو ٹھیک رہتا ہے گھاس ۔ لکڑیاں دے جایا کر ۔ جا ۔ کوئی فکر نہ کر ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ۔"

" آپ کے چرنوں کا ہی سہارا ہے ۔" مالک کے سامنے زمین پر اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے بھاگاں نے کہا ۔

جھونپڑی کے ساتھ ہی دو کنال زمین تھی ۔ اسی کی بدولت بھاگاں کے خاوند کا نام پٹواری کے کاغذات میں درج تھا ۔ مکئی کی فصل کٹ چکی تھی ۔ اب دھان کے لئے زمین تیار کی جا رہی تھی ۔ پہلے ان دنوں بھاگاں کا خاوند ایک ۔ آدھ دن کے لئے کسی سے ہل بیل مانگ لایا کرتا تھا ۔ لیکن اس بار بھاگاں خود ہی پھاوڑا لے کر جٹ پڑی ۔ دھوپ اور مشقت سے اُس کے سانولے چہرے کا رنگ تپے ہوئے تانبے کی طرح ہو گیا ۔ کام میں وہ اس طرح منہمک تھی گویا اپنی بپتا کو گاڑ دی ۔ دبا دی جلا ہی ہو ۔

کمر سیدھی کرنے کیلئے اُس نے سر اوپر اٹھایا ۔ دیکھا کہ اُس کا پڑوسی سنتو درخت کی شاخ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا ۔ بھاگاں بھی غیر شعوری

طور پر مسکرا دی۔

"بھاگاں! پھر سنیتو مر گیا۔ لیکن ہم تو ابھی زندہ ہیں۔ ہمارے جیتے جی تو نے یہ پھاوڑا کیوں پکڑ لیا ہے"۔ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے سنیتو پھر بولا۔ "بھاگاں! تمہارے نازک ہاتھ اس کام کے لئے نہیں بنے ہیں"۔

بھاگاں پھاوڑا چلاتی رہی۔ سنیتو نے پاس آکر کہا۔ "بھاگاں! تو رہنے دے۔ میں خود یہ سب کر دوں گا۔ چل تو چھاؤں میں بیٹھ ورنہ تیرا یہ پھول جیسا نازک جسم اس دھوپ میں جھلس جائیگا"۔

دوسرے دن صبح بھاگاں کے کھیت میں سنیتو ہل چلا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے بھاگاں بڑے بڑے ڈھیلوں کو اپنے تلوٹے سے پھوڑتی چلی جا رہی تھی۔ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تلوٹے کو ہوا میں اچھال کر ڈھیلوں پر مارتی تو کھسر کھسر کی آواز پیدا ہوتی اور تلوٹے پھر لہرا کر بھاگاں کے کندھے پر آ جاتا۔ ڈھیلے توڑتے توڑتے بھاگاں بھول گئی کہ وہ بیوہ ہے اور کہ ہل جوتنے والا اس کا خاوند نہیں بلکہ اس کا پڑوسی سنیتو ہے۔ اچانک اس کے ہونٹ۔ جن کی تازگی اور گلابی رنگت پر دھول کی ایک ہلکی سی پرت جم گئی تھی۔ کانپ اٹھے۔ جیسے کسی پرندے نے پہلی بار اپنے پر ہوا میں تولے ہوں یا کسی خشک باؤلی میں پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا ہو۔ بس اسی طرح اس کے گلے سے گانے کے سُر ابل پڑے ۔ ۔ ۔ ۔

"رس لیئی گیا بھنڈرا . . . . ." (بھنورا پھولوں کا رس چرا لے گیا ہے) اس کے جواب میں۔ "ہاں بھئی ہاں" کی سوائی لگانے والا ڈرم

اب کہاں تھا! ۔ اور سنیتو کے کانوں تک یہ بول شنا ہار پہنچے ہی نہیں تھے دو۔ چار گھنٹوں میں کام ختم ہو گیا۔ سنیتو نے بیل اب ہلکے میں جوت لیئے۔ "آؤ بھی اب اپنی تھکان ہلکی کر لے"۔ سنیتو نے بھاگاں کو پکارا۔

"نہیں بیل بہت تھک گئے ہیں"۔ بھاگاں نے عذر پیش کیا۔

چھاتی پر ہاتھ رکھ کر سنیتو نے کہا "میرے بیل۔ اور اتنے سے کام سے تھک جائیں؟"۔ بھاگاں موئی! کوڑیوں کے دام بیچ ڈولاں! نہیں تیری قسم!"۔ یہ کہہ کر سنیتو نے بھاگاں کو کھینچ کر اپنے سونگے پر چڑھا لیا۔ اور اپنے کان میں انگلی دے کر سنیتو نے بھاکھ لگائی

"پہاڑی چناں بکھرو آ ۔ تیرے مٹھڑے مٹھڑے بول"

(اے چاند کی طرح خوبصورت پہاڑی بہار ے۔ تیرے سُر میں کتنی مٹھاس بھری ہے)

بھاگاں چپ چاپ سنتی رہی۔ سنیتو نے اس کا کندھا دبا کر کہا۔

"موئی! جواب دے نا"۔ بھاگاں پھر خاموش رہی۔

"تجھے میری قسم!"۔ کہہ کر سنیتو نے پھر بھاکھ لگائی۔۔۔

"پہاڑی چناں بکھرو آ۔ تیرے مٹھڑے مٹھڑے بول۔۔"

بھاگاں کے ہونٹ کانپ اٹھے۔ جواب میں وہ گنگنائی۔

"اپنی بولی کی آں بولاں؟ ۔ ماری لیندے راجے لوک۔۔۔" ۴۰

کام ختم ہونے پر بھاگاں نے سنیتو کو کھانا کھلانے کیلئے روک لیا۔ نمک مرچ کے ساتھ دونوں نے سفید مکئی کی روٹیاں کھائیں پھر اسی طرح دونوں میں رابطہ بڑھتا گیا۔ بھاگاں وہ نہ تھی کہ ـــ

۴۰۔ صیاد گھات لگائے بیٹھا ہے۔ میں زبان کیسے کھولوں؟

"جس جگہ پہ جا لگی - وہی کنارہ ہو گیا"

بھاگاں کے ہاں بچہ پیدا ہوا۔ اُس کے ویران آنگن میں ایک پھول کھلا۔ مگر وہ تین دنوں سے سیٹھ نے اِدھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ بھاگاں کے لئے اب وہ جنگل کا مور بن چکا تھا۔ اپنے آپ کو وہ بھاگاں کے بچے کا باپ نہیں مانتا تھا۔ بھاگاں کو اِس کا کوئی گلہ یا شکوہ نہ تھا۔ کہیں مل جاتا تو اب بھی وہ اِس سے یوں پیش آتی۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے دونوں کے درمیان کوئی تلخی کوئی بیگانگی یا بیگانگی نہ ہو۔ بچے کو پیٹھ پہ باندھ کر بھاگاں زمیندار کے ہاں بیگار دینے لگی۔ پہلی بار جب بچے کو لے کر وہ زمیندار کے گھر پہنچی تو اُس نے کہا۔

"چلو۔ ٹھیک ہوا بھاگاں۔ تیرے سر کا بوجھ ہلکا ہو گیا"

زمین پر ماتھا ٹیکتے ہوئے بھاگاں نے جواب دیا۔ "اَن داتا! آپ کے چرنوں کی چھاؤں میں پل جائیگا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ بڑا ہونے دے اِسے۔ پھر یہیں ٹکا رہیگا۔" بھاگاں کو تسلی دیتے ہوئے زمیندار بولا۔ کل گھاس کی کٹائی ہے۔ صبح جلدی آجانا۔"

بھاگاں کے کھیت کی گرداوری تھی۔ پٹواری گرداوری کا ایک روپیہ لیتا تھا۔ لیکن وہ بیچاری روپیہ کہاں سے دیتی بھا۔ "منشی جی مجھ رانڈ کے پاس زہر کھانے کو بھی پیسہ نہیں ہے"۔ بھاگاں نے گویا اپنے آپ کو بے پردہ کر دیا۔ پٹواری بھاگاں سے بھی بے پردہ نکلا۔ "واہ۔ بڑی چالاک بنتی ہو۔ جن مشٹنڈوں کے جنتی ہو کیا وہ بھی لٹ چکے ہیں؟"

"منشی جی! جس نے لاکھوں کا لال دیا۔ اُس نے باقی کیا رکھا"؟ بھاگاں نے اپنے بیٹے مُرکو کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں کچھ نہیں جاننا!" ہاتھ نچاتے ہوئے پٹواری نے کہا۔ "روپیہ نہیں ہے تو آٹھ گٹھے ایندھن ہمارے گھر دے آنا"۔

"میں اُن بچے۔ اُن پچے درختوں پر کیسے چڑھ سکوں گی منشی جی؟" بھاگاں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔

"کسی بارہ سے کہنا۔ وہ اُتار دے گا"۔ پٹواری نے جلا کر کہا۔

بھاگاں نے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "منشی جی! آپ مخول کرتے ہیں۔ اچھا میری بتیرو گائے دودھ دے گی تو آٹھ دن آپ کے ہاں دودھ دے آؤں گی"۔

بھاگاں کا مُرکو دو سال کا ہو گیا۔ ماں کی پیٹھ ہی ابھی تک اُس کے لئے دھرتی تھی۔ چلتے پھرتے بھاگاں اُسے پیٹھ پر اُٹھائے رکھتی تھی۔ جنگل سے لوٹتے وقت، جب کبھی مُرکو ماں کی پیٹھ پر لدے لدے تنگ آجاتا تو منہ آگے کی طرف کر کے ماں کی طرف دیکھ لیتا۔ تو اپنے بوجھ کو بھول کر بھاگاں یوں مسکرا دیتی جیسے اُس کے پاس سبھی کچھ ہو۔ دُنیا کی ہر دولت! ماں کو مسکراتے دیکھ کر ننھا مُرکو بنفشہ کے پھول کی طرح کھل اُٹھتا۔

بتیرو گائے کو بیائے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اسی اُمید میں وہ آج تک مُرکو کو اپنی خالی خشک چھاتیوں سے ٹھگتی آ رہی تھی۔

ایک دن شام کے وقت زمیندار ایک اور آدمی کو ساتھ لے کر بھاگاں کے جھونپڑے میں آیا۔ بیٹھنے لائق کوئی جگہ نہ دیکھ کر اس

نے کھرڑے کھرڑے ہی کہا۔۔۔

"بھاگاں! اب سُود تو اصل رقم کو بھی پار کر گیا ہے اس طرح کیسے چلے گا؟۔ ویسے تو ہماری پرانی آسامی ہے۔ پھر بھی اپنے سر سے بوجھ اتارنے کی فکر تو کرنی ہی چاہیئے۔

بھاگاں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کہ کیا جواب دے تھوڑی دیر رُک کر مالک نے پھر کہا۔ "مہینہ بھر تو نے گائے کا دودھ پی لیا ہے۔ اب بیس ۲۰ روپؤں میں میں اسے لئے جارہا ہوں"۔

بھاگاں کو محسوس ہوا کہ اُس کی پیٹھ مرکو کے بوجھ سے ہلکی ہو گئی ہے۔ زمیندار کی نگاہیں اِدھر۔ اُدھر کچھ اور بھی ڈھونڈھ رہی تھیں۔ لیکن وہاں غربت کے سوا اور تھا ہی کیا۔

"بھاگاں!۔ اِس طرح کب تک چلے گا؟"۔ اُسے چُپ دیکھ کر مالک نے پھر کہا۔

"اچھا تیرا مرکو بڑا ہولے۔ پھر اسے ہم اپنے ہی پاس رکھ لیں گے۔ تب تو بھی بے فکر ہو کر مزدوری کر سکے گی۔"

"مالک آپ کا ہی سہارا ہے"۔ بھاگاں نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

مالک کا اِشارہ پاکر دوسرے آدمی نے کھُونٹے سے گائے کھول لی۔ بچھڑے کو مالک خود کھول لئے گئے۔ بے زبان کسی اجنبی کو اپنا رسّہ کھولتے دیکھ کر گائے رنبھا اُٹھی۔ گویا اُسے بھاگاں سے جدا ہونے کا علم ہو گیا ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے بھاگاں کا آنگن سُونا ہو گیا۔ وہ بچاری

ہکّی بکّی بیٹھی دیکھتی رہی۔ اُس کے سامنے دودھ کی چھوٹی سی ہانڈی مُنہ پھیلائے پڑی تھی۔ جسے آج ہی اس نے دودھ ابالنے کے لئے خریدا تھا۔ ڈپٹی۔ ڈپٹی ناؤں اور پٹواری سے نپٹ کر آج اُسے مُرکو کو دودھ پلانا تھا۔۔۔۔۔۔ مُرکو کو کھینچ کر اُس نے اپنی سوکھی چھاتیوں سے چمٹا لیا۔

جس دن گاؤں میں پرائمری سکول کھلا۔ تو وہاں کافی رونق ہو گئی۔ اِس تقریب میں حصہ لینے کے لئے پاس کے قصبہ سے بھی کچھ لوگ آ گئے۔ ایک معزز آدمی نے قینچی سے ریشمی فیتہ کاٹا۔ اور حاضرین نے زور۔ زور سے تالیاں بجائیں۔

اِفتتاحیہ رسم ادا کرنے والے صاحب نے اپنی تقریر میں کہا۔ "تعلیم ہی ہماری ترقی کی بنیاد ہے۔ اب گاؤں گاؤں میں اسکول کُھل رہے ہیں۔۔۔۔۔"

اِس جلسے سے لوٹ کر زمیندار صاحب بھاگاں کے آنگن میں آئے۔ اب انہیں اپنے بیٹے کو سکول میں داخل کروانا تھا۔ اس لئے اپنے مال مویشیوں کی رکھوالی کے لئے بھاگاں کے مُرکو پر اُن کی نظر پڑی۔ روٹی۔ کپڑا اور موازی دس آنے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ جو کہ قرض کے بیاج میں مُجرا ہوگی۔

سب باتیں طے کرتے چلتے چلتے زمیندار صاحب کہنے لگے "بھاگاں! کل بڑا مبارک دن ہے۔ صبح سویرے ہی مُرکو کو ہمارے ہاں بھیج دینا۔" پھر مُسکرا کر بولے۔ "نوکری ابھی کیا کرے گا ابھی تو ہمیں ہی اِس کی نوکری کرنا پڑے گی"

رات کو بھاگاں کا جھونپڑا اندر سے بند تھا۔ لیاکھڑیوں سے کالے کڑوے، بدبُودار دھوئیں میں بیٹھے ماں بیٹا مکئی کی باسی روٹی کھا رہے تھے۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی چارپائی پڑی تھی چارپائی بنا ڈھکن کے ٹوٹے پھوٹے صندوق کی طرح نہ کھائی دے رہی تھی۔ پھٹے پُرانے لحافوں میں رُوئی کی بجائے پُرانا گودڑ بھرا ہُوا تھا۔ اِن پر کھٹمل یُوں دوڑ رہے تھے جیسے کسی اندھیری تلھٹی میں سوروں کا بڑا سا گلّہ کچھ سُونگھتا۔ ڈھونڈتا چلا جا رہا ہو۔

"مرکُو! تُو کل سے مالک کے ہاں نوکری کرے گا"۔ بھاگاں نے یُوں کہا گویا اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہی ہو۔

مرکُو ٹھمک کر بولا۔ "اَخا! اب تو بڑا مزا آئیگا۔ کھانے کو کبھی کبھی دال بلا کرے گی"۔ باسی روٹی کا نوالہ نگلتے ہوئے اُس نے پُوچھا۔ "پر امّاں۔ تُو؟"

بھاگاں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر تُو ہوش سے کام کرنا وہاں۔ بیٹھنا ہو تو ہمیشہ دُور کہیں کونے میں خالی جگہ بیٹھا کرنا۔ اُن لوگوں کو دیکھتے ہی تعظیم سے سر جُھکا دینا۔ سمجھے بیٹا؟ ہم نیچ لوگ ہیں۔ ان بڑے لوگوں کی چھاؤں میں ہی ہمارا ٹھکانا ہے"۔

"پر امّاں! ہم نیچ کیوں ہیں؟"

"اِس لئے کہ ہم غریب ہیں"

"اور غریب کیوں ہیں ہم امّاں؟"

"ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا! کہیں اُن داتا کے گھر میں ایسی باتیں نہ پُوچھ بیٹھنا۔"

لیاکھڑیوں = چیل کے درختوں کی لکڑیاں

مُرکُو نے تُنک کر کہا۔ "مَیں نہیں کروں گا اُن داتا کی نوکری۔ مَیں تیرے پاس ہی رہوں گا۔"

بھاگاں نے اُسے چھاتی سے لگا کر کہا۔ "نہیں بیٹا۔ ہمارا مرنا۔ جینا۔ دُکھ سُکھ۔ سب اُن ہی کے ہاتھ ہے۔ اور پھر تو وہاں اکیلا تھوڑے ہی رہے گا۔ ۔ ۔ ہماری ہیرو گائے بھی تو وہیں ہے۔ تمہیں ہیرو کا پتہ ہے نا؟۔ وہی جس نے چھوٹا سا بچھڑا دیا تھا۔"

مُرکُو کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ہماری ہیرو وہیں ہے اماں؟ تب مَیں دال نہیں کھاؤں گا۔ دودھ پیوں گا۔ دودھ دال سے اچھا ہوتا ہے نا۔ اماں؟"

"نہیں۔ نہیں" بھاگاں نے جھٹ کہا۔ "دال اچھی ہوتی ہے دودھ سے۔ اور پھر دال سے بھی مکئی کی باسی روٹی اچھی ہوتی ہے۔ جس سے آنکھوں میں روشنی آتی ہے۔ تو وہاں ہیرو کا دودھ مت مانگنا۔ ورنہ اُس کا بچھڑا بھوکا رہ جائے گا۔ نہیں مانگے گا نا؟"

مُرکُو اداس ہو گیا۔ اُس نے سر ہلا کر "نہ" کر دی۔

صبح جلدی ہی بھاگاں نے مُرکُو کو جگایا۔ اُس کے کندھے پر پھٹی۔ پرانی چادر رکھ دی اور رات کی بچی ہوئی آدھی روٹی کھلا کر اُسے چلنے کے لئے کہا۔ مُرکُو بلا مرضی تیار ہو گیا۔ بھاگاں نے سُونی۔ سُونی نظروں سے گھر کے اندر۔ باہر جھانکا اور پھر مُرکُو کو گود میں بھر کر بے اختیار رو پڑی۔ "ہیرو نے آنگن سُونا کیا تھا۔ لیکن بیٹا! آج اندر و باہر سب سُونا ہو گیا"۔ ماں کے آنسو دیکھ کر مُرکُو بھی رو پڑا۔ بیٹے کو ڈھارس بندھاتے ہوئے بھاگاں نے کہا۔ "بیٹا ہمارا یہی دھرم

ہے۔ بھگوان تمہیں لمبی عمر دے۔ اور کچھ نہ سہی۔ بیاج تو چکتا جائے گا"۔

اپنا مرکو "ان داتا" کو سونپ کر بھاگاں جب لوٹی۔ تو اسے محسوس ہوا کہ آج وہ پھر بیوہ اور بے سہارا ہو گئی ہے۔ ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح وہ کھاٹ پر گر پڑی۔ اس نے مرکو کے سونے کی جگہ کھاٹ پر خالی چھوڑ دی۔ اسے اب بھی مرکو کے سانسوں کی سہانی تپش محسوس ہو رہی تھی۔ مرکو کا چہرہ الگ الگ صورتوں میں۔ مسکراتا ہوا۔ روٹھتا ہوا۔ روتا ہوا۔ اسے دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے آس پاس اسے مرکو کی موجودگی کا احساس ہونے لگا باہر صحن میں بھیرو رمبھاتی ہوئی سنائی دینے لگی۔۔۔ اچانک اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا۔ کہ وہ گہرے پانی میں ڈوب رہی ہے۔ اس کے پاس ہی مرکو ڈوب رہا ہے۔ اس کے شوہر کی لاش بھی پاس ہی تیر رہی ہے۔ اس کے پڑوسی ڈوب رہے ہیں۔ چلا رہے ہیں۔ پھر اسے دکھائی دیا کہ پانی کی سطح پر کئی لوگ اجلے کپڑے پہنے کشتیوں پر سوار ہیں۔ کچھ لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ کوئی۔ کوئی لفظ اس کی سمجھ میں آ رہا ہے۔۔۔ "بچاؤ۔ ڈوبنے والوں کو بچاؤ۔ آئندہ کوئی نہیں ڈوبے گا۔ پانی کی چھانی پر ہم نے قابو پا لیا ہے۔۔۔"۔ لوگ تالیاں پیٹتے ہیں۔ ڈوبنے والوں کی طرف جال اور رسے پھینکے جا رہے ہیں۔ لیکن وہ جال اور رسے ڈوبنے والوں تک نہیں پہنچ رہے ہیں۔ بھاگاں چلاتی ہے۔ "ہم بہت گہرے ڈوب رہے ہیں ہمیں بچاؤ"۔ مگر اوپر تیرنے والوں نے کچھ نہیں سنا۔ ادھر بھاگاں کی

سانس اُکھڑ رہی تھی۔ مُرکُو کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ بڑی زور سے چِلّائی۔ "مُرکو! مُرکو!! مُرکو!!!"

شام جب اندھیرے سے بوجھل ہو گئی۔ تو بھاگاں کی بے ہوشی دُور ہوئی۔ اُس کا جسم پسینے سے تر تھا اور اُس کے جسم پر کھٹمل رینگ رہے تھے۔ کوشش کرنے پر بھی وہ اُٹھ نہ سکی۔

صُبح بخار سے بھاگاں جل رہی تھی۔ اُس کے لئے اُٹھنا بھی مُحال تھا۔ پھر بھی سَر اور کمر پر چادر باندھ کر وہ اُٹھی اور اَن داتا کے لئے گھاس کا گٹھر لانے کیلئے جنگل میں چلی گئی۔ وہ چل نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی آہستہ۔آہستہ جیسے تیسے وہ آگے بڑھتی گئی۔ شام تک گھاس کاٹتی رہی اور پھر بڑا سا گٹھر بنا کر اُٹھا لائی۔ بس اِسی طرح وہ دن بھر اپنے جسم کو گھسیٹتی چلتی اور رات کو بُخار سے تڑپتی رہتی اور مالک کی بیگار دیتی رہتی۔ کبھی کبھی مُرکُو آکر پانی کا گھڑا اُس کے سرہانے رکھ جاتا تھا۔ لیکن اُسے اِتنا وقت ہی کہاں مِلتا تھا کہ ماں کی بیمار پرسی یا تیمارداری کے لئے ہر روز آسکے۔ ایک دن وہ آیا۔ تو بھیڑیا مالک کی دو بھیڑیں مار گیا تھا۔ اُن کی قیمت مُرکُو کے نام درج ہو گئی تھی۔

بھاگاں بے سُدھ پڑی تھی۔ دوٹوں کا پرچار کرنے والے اُس کے جھونپڑے میں آگئے۔ بھاگاں اُن کی آمد کی وجہ نہ سمجھ سکی۔ وہ صرف اِتنا ہی جان سکی کہ اُن میں سے ایک اُس کے اَن داتا کا بڑا بڈیا ہے۔ ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ ....
"آپ دیکھ رہی ہیں......"۔ عزت کا یہ خطاب بھاگاں کو

زندگی میں پہلی بار ملا تھا۔ "۔۔۔ اِن گاؤں کو ہم سورگ بنا دیں گے ۔۔۔۔ آپ اپنا ووٹ ۔۔۔۔۔"۔

بھاگاں ایک لفظ بھی نہ سمجھی۔ اُس نے آہستہ آہستہ ہاتھ اُٹھا کر ماتھے سے لگائے اندر کہنے لگی۔ "اَن داتا! مجھ سے اُٹھا نہیں جاتا ۔۔۔۔"

دُوسرے آدمی نے جواب دیا۔ "فکر نہ کریں۔ ہم آپ کی کھاٹ اُٹھا کر لے جائیں گے ۔۔۔۔ آپ اپنا ووٹ۔۔۔"

صبح دو آدمی بھاگاں کے جھونپڑے میں آئے ۔۔۔ لیکن بھاگاں پہلے ہی اپنا ووٹ ڈال چکی تھی ۔۔۔۔

اگلے دن اَن داتا چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ اُن کے سامنے مُرکُو زمین پر بیٹھا تھا۔ "اَن داتا! اماں جی کے ودی بار کرنے ہیں۔ آپ ہی کچھ دیں۔ آپ ہی کا سہارا ہے ۔۔۔ آپ کے ہی پاؤں کی چھاؤں ۔۔۔"

از
شری وید راہی

یہ پیٹ میرے نہیں

راجالی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کوٹھری میں اُس کا دم گھٹ رہا تھا۔ باہر شاید برف باری ہو چکی تھی۔ لیکن اتنی سردی کے باوجود اُس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں پھوٹ رہی تھیں اور اُس کے سینہ میں جیسے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اُس کا گلا سوکھ رہا تھا۔ اُسے شدت کی پیاس لگی تھی مگر وہ اٹھ کر باہر کیسے جائے۔ باہر جانے کے لئے اُسے اُس دالان میں سے گذرنا تھا۔ جہاں اُس کا باپو اور اُس کا دولہا مہنت رام سوئے ہوئے تھے۔

آخر اُس سے رہا نہ گیا۔ وہ مجبور ہو کر اُٹھی اور دبے پاؤں دروازے کے پاس آئی اور بڑی محتاط ہو کر دروازہ کھولنے لگی تاکہ آہٹ پا کر کوئی جاگ نہ پڑے۔ وہاں اِتنا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر بھی اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُسے

معلوم تھا۔ کہ اُس کا باپو اور اُس کا خاندان وہاں سوئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اُس نے خود ہی دونوں چارپائیوں پر بستر بچھائے تھے۔

فراٹے سے وہ کمرے سے نکل کر آنگن میں جا پہنچی۔ گھڑے کا پانی یخ ٹھنڈا تھا لیکن ایک کٹورا پانی پینے کے بعد ہی اُس کی پیاس بجھ سکی۔ پانی پی کر اُس نے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا اور کتنی ہی دیر تک وہیں بیٹھی رہی۔

برف گرنے کے آثار تو نہیں تھے لیکن ہوا برف سے بھی زیادہ سرد تھی۔ پھر وہ اُٹھی اور صحن کی دیوار کا سہارا لیکر کھڑی ہو گئی۔

پورن ماشی کی رات تھی۔ سامنے والی پہاڑی کے پیچھے سے چاند آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ راجاں نے چاروں طرف دیکھا۔ تمام گھاٹی پر چاندنی بکھر رہی تھی۔ اچانک اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سوچنے لگی۔ "اگر میرا گورا بدن چاندی کی طرح پگھل کر اس چاندنی میں تحلیل ہو جائے اور اس پربت کے ہر درخت سے۔ درخت کے پتے پتے سے اور پربت کے ذرّے ذرّے سے بغلگیر ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ تب میرا دولہا کل مجھے ڈولی میں بٹھا کر یہاں سے دور۔ بہت دور میدانوں کی طرف اپنے گاؤں میں کیسے لے جائے گا؟"۔ آنسو اُس کے رخساروں پر سے ڈھلنے لگے۔

ماں کے فوت ہو جانے پر اس گھاٹی نے ہی راجاں کو ماں کی ممتا دی تھی۔ اُس کا باپو گھاٹی کے نچلے حصہ میں ایک پن چکی کا مالک تھا۔ اُسے دن بھر وہاں سے فرصت نہ ملتی تھی۔

دِل بہلانے کے لئے راجاں دِن بھر اپنی گائے اور بکری کو چراتی ہوئی اِن پربتوں۔ ٹیلوں پر چڑھتی اُن پر سے اترتی رہتی۔ اونچے سُروں میں میٹھے پہاڑی گیت گانے لگتی۔ اِن پربتوں کے ایک ایک درخت سے اُس کی پُرانی واقفیت تھی۔ مرغزاروں میں کِھلے پھولوں کے بچھونے اُس کے جسم سے نکلنے والی خوشبو پاکر جھوم اُٹھتے تھے۔

گھاٹی کا ایک ایک چشمہ۔ ایک ایک جھرنا اُس سے باتیں کرتا تھا۔ اکیلے پن سے جب راجاں گھبرا جاتی تو یہی جھرنے اُس کے ہمجولی بن کر اُس کے اکیلے پن کو ڈھونڈ لیتے تھے اور اُس کی اداسی کو مِٹا کر لے جاتے تھے۔

اِن پربتوں کی گود میں پرورش پاکر وہ اتنی بڑی ہوئی تھی یہاں ہی اُس نے بچپن کی حدیں پار کر کے دوشیزگی میں قدم رکھا تھا۔ مگر اُسے کیا معلوم تھا کہ یہ جوانی ہی اس کی دشمن بن جائیگی!

چارہ دِل ہوئے راجاں کے والد نے اُس کی شادی کر دی۔ آج گونا بھی ہو گیا۔ کل نہنستے رام کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اُسے یہاں سے جانا ہوگا۔ یہ پربت۔ یہ گھاٹی۔ اِن چشموں کی جدائی سو کل وہ آنچل میں باندھ کر لے جائے گی اور اِن کی یاد کو وہ ہمیشہ اپنے سینہ سے لگائے رکھے گی۔ اور اِن یادوں کے سہارے زندگی بسر کرے گی۔

یہ سب سوچتے۔ جیسے اُس کی سوچ بھی بوجھل ہو گئی آنکھیں آنسوؤں کے چشمے بن گئیں۔ اور وہ پھپھک۔ پھپھک کر رو پڑی۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ بے ہوش ہو رہی ہے دیوار

کو اُس نے زور سے تھام لیا۔ لیکن اچانک اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اُسے وہیں بیٹھ جانا پڑا۔

چاند کافی اوپر آ چکا تھا۔ گھاٹی پر اس کی چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ چیل کے درختوں میں سے نکلتی ہوا کی سرسراہٹ سانپ کی پھنکار سی لگ رہی تھی۔ دور نیچے بہنے والے نالے میں پانی کا شور بڑھ رہا تھا۔۔۔ اندر راجاں۔ اِن پربتوں کی بیٹی۔ اُسی طرح گھٹنوں میں سر دبائے روتی جا رہی تھی۔

کافی دیر بعد جب وہ پھر اپنی کوٹھڑی میں گئی۔ تو اُس کا باپو اور مہنت رام دونوں سو رہے تھے۔

دوسرے دن اُسے وداع کرتے ہوئے اُس کے باپو نے کہا!

"بیٹی! میں تمہیں جلدی ہی بلا لوں گا"۔ لیکن اُس نے باپو کے یہ الفاظ شاید سُنے ہی نہیں۔ پھر۔ آنگن سے راجاں کی ڈولی جب دور نیچے جا پہنچی۔ تو نہ جانے کہاں سے 'ممولوں' کا ایک جوڑا پالکی کی پھننگی پر آ بیٹھا اور وہ لگاتار سُروں میں چہکنے لگا۔ پالکی کے اندر بیٹھی راجاں کا دل اُچھل کر جیسے باہر آنے لگا۔ راجاں کے گھر کے نیچے والے جھرنے کے پاس ہی 'ممولوں' کا ایک جوڑا رہتا تھا۔ یہ ممولے راجاں کو وہاں نہ پا کر وداع ہوتی ڈولی پر آ بیٹھے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ پالکی کا پردہ ہٹا کر آخری بار اِن ممولوں کو دیکھ لے۔ لیکن شاید مہنت رام کے ڈر سے وہ پردہ سرکا نہ سکی گھاٹی سے نکل کر پالکی جب پہاڑ کی چوٹی پر پہنچی۔ تو ممولے اپنی بولی میں نہ جانے کیا کچھ کہہ کر اُڑ گئے۔

ممولا [illegible] ایک چھوٹی سی پہاڑی چڑیا + ممولا اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے [illegible] لڑا دے ممولے کو شہباز سے (اقبال)

درختوں میں سے گذرتی۔ پہاڑوں کو پار کرتی۔ راجاں کی پالکی اُسی روز شام کو اُس کے سسرال والے گاؤں میں آ پہنچی۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں عورتوں سے گھری ہوئی راجاں کا دم گھٹنے لگا۔ اُس کی چھاتی بھاری ہو گئی اور گلا سُوکھنے لگا۔ بیچاری کسی سے یہ بھی نہ کہہ سکی۔ کہ اُسے پیاس لگی ہے۔

رات کو جب مہنت رام نے اُس کا گھونگھٹ اُٹھایا تو نہ جانے کیوں راجاں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مہنت رام نے آگے بڑھ کر اُس کے آنسو پونچھ ڈالے اور اُسے چھاتی سے لگا لیا۔

اُس چھاتی میں پتہ نہیں محبت کی کتنی تپش تھی کہ راجاں کے دل کا بوجھ برف کی طرح پگھلنے اور آنسو بن کر باہر نکلنے لگا۔ آخر اُس کا بوجھ ہلکا ہوا۔ آنسوؤں کا سیلاب ختم گیا۔ اُسے ڈھارس بندھاتے ہوئے مہنت رام نے کہا۔ "رونے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد ہی تجھے باپو کے پاس چھوڑ آؤں گا"

مہنت رام کی آواز میں اِتنی مٹھاس اور صداقت تھی کہ راجاں کو یقین ہو گیا کہ واقعی وہ اُسے پھر اُس کے پربتوں پر چھوڑ آئے گا۔ مہنت رام اُسے دیوتا کی طرح نیک اور مہربان دکھائی دینے لگا۔

مہنت رام ویسے بھی بہت خوبصورت اور تندرست نوجوان تھا۔ کھڑا ہوتا تو راجاں کو گردن اُٹھا کر اس کی شکل وصورت دکھائی دیتی تھی۔ اُس کے چھوٹے چھوٹے گھنگریالے بال۔ اُس کے کانوں کی مُرکیاں اور اُس کے گلے کا تعویز بہت ہی خوبصورت دکھائی

دیتے تھے۔ راجاں کا جی چاہتا تھا۔ کہ وہ اس کی چھاتی پر سے اپنا سر کبھی نہ اُٹھائے۔ اس پردیس میں اجنبی لوگوں کے بیچ اس کا وہی سہارا تھا اور ہنست رام سوچ رہا تھا کہ راجاں کتنی خوبصورت، کتنی بھولی اور ناداں ہے۔

دو تین دنوں کے بعد ہنست رام نے راجاں کو بتایا۔ "تیرا باپو اہنت دار کو تجھے لے جانے کے لئے آ رہا ہے"۔ یہ سُن کر کہ راجاں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس کے خیالات بدلنے لگے۔ وہ خود سمجھ نہ سکی کہ اس اچانک تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟۔

رات کو جب وہ ہنست رام کی گود میں سر رکھے ہوئے لیٹی ہوئی تھی تو ہنست رام نے پوچھا۔ "تجھے اپنا گاؤں بہت پیارا لگتا ہے؟"۔

"ہاں"۔ راجاں نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"ایسی کون سی چیز ہے وہاں؟۔ کیا اس لئے کہ باپو اکیلا ہے؟"

راجاں سوچنے لگی کہ کیا جواب دے۔ اُس کے باپو نے کبھی اُسے گلے نہیں لگایا۔ لیکن یہ بھی کیسے کہے کہ اُس گھاٹی میں۔ گھاٹی کے پربتوں میں۔ اُن جھرنوں اور درختوں میں اُس کے پران بسے ہوئے ہیں اُسے کیسے بتائے کہ اُس کا سب کچھ وہیں ہے۔

"اس بیابان جنگل میں ایسا کیا ہے جس کی خاطر تو مجھے بھی اکیلے چھوڑ کر وہاں جانا چاہتی ہے"؟

"نہیں۔ تمہیں چھوڑ کر میں نہیں جانا چاہتی"۔ اچانک راجاں کے مُنہ سے نکل پڑا۔ ہنست رام یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ لیکن بولا

کچھ نہیں۔

اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے راجاں ہی بولی۔ "پہلے کبھی میں اُس گاؤں سے باہر نہیں نکلی۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرا سب کچھ یہیں رہ گیا ہے۔ وہ پربت۔ وہ جھرنے۔ وہ جھیل اور دیودار کے درخت مجھے بہت پیارے ہیں۔۔۔" کہتے کہتے راجاں اپنے ہی خیالوں میں کھو گئی۔ اُس کا بچپن اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔

مہنت رام اُس کی یہ باتیں سُن کر حیران رہ گیا۔ اُس نے ایسی باتیں پہلے کبھی نہیں سُنی تھیں۔ یہ الہڑ۔ انجان پہاڑی لڑکی کیا کہہ رہی تھی؟

بابو کے آنے میں دو دن باقی تھے۔ راجاں کو یوں محسوس ہونے لگا کہ وہ مہنت رام کے بنا نہ رہ سکے گی۔ اُس نے پوچھا:۔

"تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے؟"

مہنت رام یہ سُن کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔ "تو بڑی بھولی ہے"

"کیوں؟"

"میں تیرے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں؟"

"کیوں؟"

"مجھے بڑے شہر میں جانا ہے۔"

"کس لئے؟"

"نوکری کرنے کے لئے"

راجاں ہکّی۔ بکّی رہ گئی۔ اُسے زندگی میں پہلی بار مہنت رام

سے ہی پیار ملا تھا۔ اُسے ڈر لگا کہ کہیں وہ رُوٹھ نہ گیا ہو۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں باپو کے پاس نہ جاؤں۔ تو میں کبھی نہ جاؤں گی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ تجھے تو جانا ہی پڑے گا۔ تیرا جانا ضروری ہے۔"

"کیوں؟" راجاں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

مہنت رام تھوڑی دیر کے لئے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "تو تجھے کسی بات کا پتہ نہیں؟"

"نہیں"

"تجھے حاصل کرنے کے لئے میں نے تمہارے باپو کو پانسو روپے دیئے تھے۔ تین سو میرے پاس تھے۔ دو سو مجھے اُدھار لینے پڑے تھے۔ یہ اُدھار چکانے کے لئے مجھے شہر جانا پڑے گا۔ وہاں ایک۔ دو سال کہیں نوکری کروں گا۔" تھوڑا رُک کر پھر کہنے لگا۔" ویسے تجھے لے جانے کا تیرے باپو کو کوئی حق۔ اختیار نہیں ہے۔ پر یہاں اکیلی تو اُداس ہو جائے گی۔ اِس لئے جب تک میں واپس نہ آؤں تو وہیں رہنا۔"

اتنا کہنے کے بعد اُس نے راجاں کی طرف دیکھا۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا کہ گویا راجاں کی جان ہی نکل گئی ہے۔ اُس کا مُنہ کالا پڑ گیا ہے۔ مہنت رام ڈر گیا۔ اُس نے راجاں کا کندھا جھنجھوڑا۔ راجاں نے سہمی ہوئی آنکھوں سے مہنت رام کی طرف دیکھا اور جہاں کھڑی تھی۔ وہیں بیٹھ گئی۔

اتوار کو اُس کا باپو آیا۔ لیکن بہت کچھ کہنے سُننے

کے باوجود وہ اُس کے ساتھ نہ گئی۔

اور جب مہنت رام شہر جانے لگا۔ تو راجاں نے کہا کہ "تُم میرے ہی لئے مجھ سے دُور جا رہے ہو۔ اِس بات کے لئے میں معافی چاہتی ہوں۔ وہ پربت میرے نہیں ہیں۔ جنہوں نے مجھے بیچ دیا تھا۔ میں یہاں ہی رہ کر تمہاری راہ دیکھوں گی۔ جب تک کہ تم لوٹ نہ آؤ"۔

از
نرسنگھ داس پوسٹگرہ جھوال :-

جمدہ

وہ اپنے باپ کی موت پر رویا نہیں۔ بھلا روتا بھی کیسے؟ پانچ چھ ماہ کے بچے کو کیا معلوم کہ موت کیا ہوتی ہے؟۔ ماں۔ باپ کیا ہوتے ہیں؟۔ مشکل سے گھٹنوں کے بل ابھی گھسٹنا ہی سیکھا ہوگا کہ وہ ایک نئی دنیا میں جا پہنچا۔ وہ دنیا تھی اس کا ننہال! وہاں کا ہر چہرہ اُس کے لئے اجنبی تھا۔ البتہ دو چہرے جانے پہچانے ضرور تھے۔ ایک تھا اُس کی والدہ کا۔ جس کی گود میں وہ پلا تھا اور دوسرا تھا اُس کے بھائی کا جو کبھی کبھی اُسے بہلاتا تھا اور کبھی کبھی اُسے بغل میں اُٹھا لیتا تھا۔ اگرچہ اس بغل میں وہ اپنے آپ کو یوں پاتا تھا جیسے کیلے کا "چرخ" لٹک رہا ہو۔

ایک دن وہ دونوں چہرے بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور اُن کی جگہ ایک اور چہرہ آگیا۔ -- یہ تھی اُس کی نانی -- جس سے ابھی دو مہینے کی ہی جان پہچان تھی۔ نانی کی گود میں دودھ پیتے وہ رہا نہیں۔ شائد اِس لئے کہ دودھ پلانے والی چاہیے

اُس کی ماں نہیں تھی۔ مگر دودھ کا ذائقہ وہی تھا اور نپّل والی بوتل
بھی اُس نے ہاتھ پھیر کر پہچان لی تھی۔

چھ سات سال بعد بھی ایک دن وہ رویا نہیں لیکن اتنا
احساس اُسے ضرور ہوا تھا کہ اُس کی مہربان نانی جس کی پیار بھری ٹھنڈی
چھاؤں میں اُس نے یہ چھ سات سال کاٹے تھے۔ آج وہی نانی زمین
پر لیٹی ہوئی تھی۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ بڑھیا مر گئی ہے۔ لوگ
اُسے سفید چادر میں لپیٹ کر اور اوپر پھولوں کے ہار ڈال کر اُسے
کسی ایسی جگہ لے گئے تھے۔ جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آئی۔

اُس کے بعد اُسے نت نئی باتوں کا علم ہونے لگا۔۔۔ کہ یہ
اُس کا ننھیال ہے۔ کہ اُس کا باپ مر چکا ہے۔ کہ اس کی ماں اور
ایک بڑا بھائی ہے جو دوسرے گاؤں میں رہتے ہیں۔۔۔ وغیرہ۔۔۔

ماں اور بھائی کی بات سنتے ہی اُس کے جسم میں خوشی کی لہر
دوڑ جاتی اور ایک ساتھ بہت سے چہرے اُس کے سامنے اُبھر آتے
وہ میلہ میں کھوئے ہوئے بچّے کی طرح کبھی ایک کی طرف لپکتا
کبھی دوسرے کی طرف۔

اُسے کبھی خیال آتا۔ کیسی ہے وہ ماں جس نے اپنے
جگر کا ٹکڑا نوچ کر اتنی دور پھینک دیا ہے اُس کی ممانیاں اپنے
بچّوں کو نہلاتیں۔ کھلاتیں۔ پلاتیں اور مدرسہ بھیجتیں۔۔۔ یہ سب
دیکھ کر وہ گہری سوچ میں کھو جاتا۔۔۔ اُسے یوں لگتا کہ اُس کی
ماں بھی اُسے نہلا رہی ہے۔ کھلا۔ پلا رہی ہے۔۔۔ اور جب وہ اُسے
پکارنے کی کوشش کرتا تو اُس کا خواب ٹوٹ جاتا۔ اُسے معلوم ہوتا

کہ کوئی اُس کا مذاق اُڑا رہا ہے۔ یہ مذاق اُسے اِس طرح زخمی کرتا۔ گویا زہر ملیں بُجھا ہُوا نشتر اُسے آ لگا ہو۔

اب اُسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا۔ کہ جب وہ باتیں کرنے لگتا ہے تو زبان اُس کا ساتھ نہیں دیتی۔ کئی بار زبان کا کام اُسے ہاتھوں اور آنکھوں کے اشاروں سے لینا پڑتا ہے۔ اُس کی ان حرکات پر بچے ہی نہیں بڑی عمر کے لوگ بھی ہنس پڑتے ہیں۔ اِس ہنسی میں ایک طنز ہوتی جو اُس کے اندر احساس کمتری پیدا کرتی تھی۔ اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔ اُس کا جی چاہتا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

جب کوئی اُسے "جمدرہ"[1] کہہ بیٹھتا تو فوراً اُسے اپنی نانی یاد آجاتی۔ نانی کے جیتے جی کوئی اُسے ایسے بھدے نام سے پکارنے کی جُرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اب تو بات بات پر اُسے "جمدرہ" 'جلہا'، 'بقوُرا'، 'ڈیچل' وغیرہ کئی ہتک آمیز ناموں سے پکارا جا رہا تھا۔ وہ بہت دُکھی ہو جاتا اور چاہتا کہ وہ کہیں بھاگ جائے وہاں۔ جہاں اُس کی ماں۔ اُس کا بھائی رہتے ہیں۔

ایک دن اُس نے دیکھا کہ گھر کے سب لوگ خوش ہیں۔ وہ بھی خوش ہُوا۔ وہ سوچنے لگا۔ "میں تو خوش ہوں کہ بابا مجھے ماں کے پاس چھوڑنے جا رہا ہے۔ لیکن یہ سب لوگ بھلا کیوں خوشیاں منا رہے ہیں؟۔ شاید اِسی لئے کہ ان کے سر سے بلا اُتر رہی ہے"۔ جواب بھی اُس نے خود ہی سوچ لیا۔ "تو یہ سب لوگ بھی مجھے آج تک بوجھ ہی سمجھتے رہے ہیں؟"۔ اُس کے اندر یہ شک

[1] جمدرہ = احمق۔ جو اچھی طرح بول نہ سکے۔ بوکھل۔

پیدا ہُوا۔ لیکن اِس کی صفائی دینے کے لیئے اُس کی دن بھر کی کارگزاری سامنے آگئی۔۔۔ نانی کے مرنے کے بعد اُس نے ہمیشہ اپنے بَل بُوتے سے بڑھ کر کام کیا۔ وہ صبح۔شام دو دو گھڑے پانی ڈھوتا تھا۔ اِس کے علاوہ مویشیوں کو کھولنا۔ باندھنا۔ بکریوں کے لیئے چارہ کاٹ کر لانا۔ جھاڑو دے کر کوڑا کرکٹ کھیتوں میں ڈالنا۔۔۔۔ اور مکان کی لپائی۔ پُتائی۔ غرضیکہ وہ کون سا کام تھا جو اُس نے نہیں کیا؟ "چلو جان تو چھوٹی!" یہ سوچتے ہی اُس کے ہونٹ کچھ پھیل گئے۔

جب وہ اپنے ماموں کے ہمراہ گھر سے نکلا تو اُس نے دیکھا کہ اُس سے بچھڑنے کا کسی کو ملال نہ تھا۔ کسی کی آنکھ میں اُس کے لیئے ممتا کے دو آنسو نہ تھے۔ ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھتے ہی اُسے اپنی نانی کی یاد آگئی اور چند لمحوں کے لیئے اُس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ لیکن بڑے ضبط سے اُس نے آنسو روک لیے تھے۔ شاید اِس لیئے کہ وقت رخصت کوئی اُس کی ہنسی نہ اُڑائے۔

لاری میں بیٹھ کر سفر کرنے کا آج ہی اُسے موقعہ ملا تھا۔ آج اُس کی وہی حالت تھی جو آنکھوں کا آپریشن کامیاب ہو جانے پر ایک اندھے کی ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ سڑکیں۔ بازار۔ دوکانیں۔ بھانت بھانت کے لوگ اور بھاگتی ہوئی گاڑیاں اِن سب چیزوں کے متعلق اُس نے لوگوں کو باتیں کرتے ہی سُنا تھا۔ لیکن آج وہ ایک آزاد پرندے کی طرح اُڑتا ہوا یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے "بڑے" اُسے اِتنی

تیزی سے اُڑائے لے جا رہے تھے۔ کہ سب کچھ آن کی آن میں پیچھے چھوٹتا جا رہا تھا۔

ایک مستی سی چھا رہی تھی اُس پر۔ وہ گیت گانا چاہتا تھا اپنی چھوٹی سی چونچ کھولنا چاہتا تھا۔ لیکن جب بھی وہ اپنے ماموں کی طرف دیکھتا تو اُدھر سے بس ایک ہی اشارہ ملتا خاموش رہنے کے لئے کھڑی اُنگلی!۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا۔۔ وہ ٹھیک اُس بھکاری بچے کی طرح جس کے سامنے کوئی سیٹھ ریزگاری نکال کر پھر جیب میں ڈال لے!۔

گھر آکر بھی اُسے خوشی نصیب نہ ہوئی۔ یہاں وہ اپنے آپ کو اُس جوان بچھڑے کی طرح سمجھ رہا تھا۔ جیسے ہل میں جوتنے کے لئے خرید کر کسی کسان نے اپنے صحن میں کھونٹے سے باندھ رکھا ہو۔ جس پیار محبت کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ اُسی کی ایک جھلک بھی یہاں دکھائی نہ دیتی تھی۔ دو تین دنوں میں اسے یہ ماننے کے لئے مجبور ہونا پڑا کہ دُنیا میں کوئی ایسی ماں بھی ہو سکتی ہے جو کھانا کھاتے ہوئے بیٹے کو ٹوک کر کہے۔۔۔۔۔۔۔ "زیادہ ہی سمیٹتا جا رہا ہے۔ تھوڑا تھوڑا پانی بھی پیا کر؟"

اُس نے ابھی تک ایسی عورتیں ہی دیکھی تھیں۔ جو اپنے منہ کا نوالہ بھی اپنے بچوں کو کھلا دیں۔ خود اُس کی نانی اُسے اسی طرح کھلایا کرتی تھی!۔ اپنی نانی اور اپنی ماں کے سلوک میں اتنا فرق دیکھ کر وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔

وہ کان لگا کر اپنے لئے ہمدردی کے دو الفاظ سُننے کی

ناکام کوشش کرتا۔ اُسے مجبور ہو کر سمجھنا پڑا۔ کہ یہ عورت میری ماں نہیں ہو سکتی۔ کبھی نہیں۔ گزشتہ آٹھ۔ دس سالوں میں ماں بیٹے کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہو چکی تھی۔ پیار کی جگہ شک۔ شبہ اور نفرت نے لی تھی۔ لیکن اُس نے اپنی ماں یا بھائی پر کچھ بھی ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔

اپنے ننھیال سے یہاں اپنے گھر میں اُسے ایک فرق ضرور دکھائی دیا۔ وہاں مذاق زیادہ تھا۔ نفرت کم۔ یہاں نفرت زیادہ تھی۔ ننھیال والے اُس کے تمام بُرے نام یہاں بھی پہنچ چکے تھے۔ بلکہ "جھلکھڑ" نام اُس فہرست میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ لقب پگھلے سیسہ کی طرح کانوں کی راہ اُس کے سینہ میں اُترتا تھا۔ یہ تحفہ اُس کے بھائی نے دیا تھا۔

اس چیخ چیخ سے تنگ آکر ایک دن اُس نے اپنی 'ماں' سے کہا۔ "کہیں نوکر کروا دو مجھے"

اپنی دانست میں اُس نے بڑی سوجھ بوجھ کی بات کہی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا۔ کہ سارے فتنہ کی جڑ گھر کی غربت ہی تھی

"تو نوکری کرے گا اپنا سر"۔ ماں کا یہ جواب سن کر وہ تڑپ اُٹھا اور کہنے لگا۔ "برتن وغیرہ تو مانجھ ہی سکتا ہوں گا"

یہ سُن کر ماں کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ دوسرے روز وہ اپنے بھائی کے ساتھ ایک ہوٹل میں جا پہنچا۔ خوشی کی ایک جھلک اُس کے چہرہ پر اُبھر آئی۔ شاید اُس نے سوچا۔ "یہاں پیٹ بھر کر کھانا تو مل ہی جائے گا۔ اور ماں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا"۔ اُس

کا بھائی اُسے ہوٹل میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس کے سامنے جُوٹھے برتنوں کا انبار لگا ہُوا تھا۔

ایک سال بیت گیا۔ وہی ہوٹل! وہی جُوٹھے برتن!!۔ ہاں گاہک نئے نئے ضرور دکھائی دیتے تھے۔ بچے۔ جوان۔ بوڑھے۔ گرتے سنبھلتے شرابی۔۔۔ کئی طرح کے رنگ برنگے لوگ ایک سال میں اُس کی نظروں سے گذرے۔ کئی لوگ اُسے دیکھ کر ہنستے تھے۔ کسی کسی کو دیکھ کر خود اُسے ہنسی آجاتی تھی۔

کسی دن فرصت ملنے پر وہ نہا کر۔ کپڑے دھو کر۔ کنگھی کرتے ہوئے آئینہ میں اپنا مُنہ دیکھتا تو اس کا ماتھا چمک اُٹھتا۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اُس کی شکل و صورت ہوٹل میں آنے والے کئی بابوؤں سے اچھی ہے۔

اُس کا بھائی مہینہ کے بعد ایک دن ہوٹل میں آتا اور پانچ روپے اُس کے ہاتھ میں دے کر اُس کی باقی تنخواہ گھر لے جاتا تھا۔ پانچ روپے کا وہ نوٹ اُس کی مٹھی میں اور اُس کا دل اُس کی چھاتی کے اندر سکڑ کر رہ جاتا۔ کبھی دکھاوے کے لئے بھی بھائی نے اس کا حال چال نہ پوچھا۔

نوٹ کو سنبھال کر وہ بٹوئے میں رکھ لیتا۔ یہ بٹوا اُسے نانی نے دیا تھا۔ بٹوا ہاتھ میں آتے ہی اُسے نانی کی یاد آجاتی۔ اُس کے مُنہ سے ایک آہ نکلتی اور آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ ان کو ٹپکنے سے پہلے ہی جُوٹھے برتنوں کا ڈھیر اُسے اپنے پاس بلا لیتا۔ اگر کوئی آنسو باغی ہو کر آنکھوں سے ٹپک بھی پڑتا تو برتن صاف کرنے والے کھردرے

کی رگڑ سے وہ منہدم ہو جاتا۔

ایک دن اُس کی تنخواہ لے کر جاتے جاتے اُس کے بھائی نے ہوٹل کے مالک سے کہا۔ اس شکروار کو میری شادی ہے۔ اگر ہو سکے تو اِسے دو۔تین دن کی رُخصت دے دیں۔ شادی ہم گاؤں میں جا کر کریں گے۔ وہاں لاری تو جاتی ہے لیکن اِس "جھلکھڑ" کو شاید پتہ ہی نہ لگ سکے۔ اِس لئے مَیں خود ہی آ کر اِسے لے جاؤں گا"۔ آج بھائی کے مُنہ سے "جھلکھڑ" سُن کر اُسے غُصہ نہ آیا۔ شادی کی بات سُن کر وہ بہت خوش ہُوا۔

اپنے ننھیال میں اُس نے دو۔تین شادیاں دیکھی تھیں۔ اب وہی جشن اُس کے اپنے گھر میں ہونے والا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اُس کا دل خوشی سے ناچ اُٹھا۔ اپنی بھابی کی گود میں بیٹھنے کی لگن کتنی مُدت سے اُس کے کلیجے میں ہمک رہی تھی۔ برتن مانجھتے۔مانجھتے وہ ایک گُدگُداتا سا خواب دیکھنے لگا۔

اُسے یُوں محسوس ہُوا کہ وہ ایک چھوٹا سا راجکمار ہے جو ایک خوبصورت پَری کی گود میں بیٹھا ہُوا ہے۔ باہر باجے بج رہے ہیں۔ اندر ڈھولک کھڑک رہی ہے۔ اُس نے گود میں بیٹھے بیٹھے ہی آہستہ سے بھابی کے لمبے گھونگھٹ میں جھانکنے کی کوشش کی۔ دو نیم وا آنکھیں اور سونے کی نتھ کے نیچے دو لال لال ہونٹ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "! برتن لاؤ۔ فٹافٹ" ۔ یہ کرخت الفاظ اُسے خواب کی سُنہری دُنیا سے باہر گھسیٹ لائے۔

شکروار تک کے دن اُس نے کئی بار انگلیوں پر گِنے۔ آخر

شکروار آگیا۔ ہر منٹ کے بعد اُس کی نظر دروازے سے ٹکرا کر لوٹ آتی۔ کئی گاہک آئے اندر چلے گئے لیکن اُس کا بھائی نہ آیا۔ سُورج کے ساتھ ہی اُس کا دِل بھی ڈُوب گیا۔ رات ہو گئی۔ رونی صُورت بنائے وہ برتن صاف کرتا جا رہا تھا۔ کام سمیٹ کر وہ لیٹ گیا۔ لیکن نیند کہاں!

وہ سوچ رہا تھا۔ کہ بارات تو اُس کے بنا بھی جا سکتی ہے لیکن دُولہے میاں کو بُوٹ کون پہنائے گا؟۔ کل بھابی کی گود میں کون بیٹھے گا؟۔ ایسی ہی کئی باتیں سوچتا سوچتا وہ رات بھر کروٹیں بارلتا رہا۔

اگلے روز برتن مانجھتے مانجھتے اُس نے سُنا۔ ہوٹل کا مالک ایک نوکر سے کہہ رہا تھا۔" اس کا بھائی تو نہیں آیا۔ تم اِسے گاڑی پر چڑھا آؤ"۔ پھر اُس نے 'جمادر' کے ہاتھ پر ۵ روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے کہا۔" اپنے ساتھ کچھ پھل فروٹ لیتے جانا اور پرسوں تک واپس آ جانا"۔

یہ پہلا نوٹ تھا جو اس کے ہاتھ میں آکر مروڑا نہ گیا تھا وہ ہنستا ہنستا اپنے مالک کا مقابلہ اپنے ماموں اور بھائی سے کر رہا تھا۔ باپ تو اُس بیچارے نے دیکھا ہی نہ تھا۔

اُس کے گھر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اُس کا بھائی دُلھن لے کر گھر آ پہنچا۔ خوشیوں کا ایک سمندر اُس کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بھابی کی گود میں بیٹھنے کی اُمنگ میں وہ یہ بھی بھُول گیا کہ وہ بھُوکا ہے۔ اُس کی ماں نے روٹی

تو در کنار چائے کے لئے بھی نہ پوچھا تھا۔ پھر اُس نے دِل کو سمجھایا۔ "ارے تو تو گھر کا آدمی ہے تجھے بھی پینے کی ضرورت ہے ؟" ۔ وہ اُٹھ کر خود ہی مہمانوں کی صف میں بیٹھ گیا۔

مذہبی رسومات ادا کرنے کے لئے "دلہن" "[illegible]" کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُسے "گلبرے" کی مٹھیاں بھرتے دیکھ کر کسی نے مخول کرتے ہوئے کہا۔ "دلہن کا ہاتھ تو اچھا بھاری ہے" ۔ باہر بیٹھے ہوئے اُس نے یہ الفاظ سُن لئے۔ اُس کا دِل خوشی سے اُچھلنے لگا۔

"دیر کیوں کر رہے ہو؟ دلیپ کو گود میں بٹھاؤ" ۔ یہ بات سُنتے ہی اُس نے جلدی جلدی ہاتھ دھو ڈالے۔ کھانا دھرا پڑا رہا۔ وہ خوشی سے پاگل ہو کر اندر بھاگا۔

"یہ رہے "[illegible]" ۔ یہ بچی تو دلیپ ہی ہے۔ اب اُس جمادر کو کہاں ڈھونڈتے پھرو گے؟ اور اُس کی ضرورت بھی کیا ہے ؟"

گھر کی دہلیز پر پاؤں رکھتے ہی ماں کے یہ الفاظ سُن کر اُسے یوں محسوس ہُوا کہ وہ کسی بہت گہرے کنوئیں میں گر پڑا ہے۔ جس کے اندر سے اُس کی آواز بھی باہر نہیں آسکتی۔

پری اور اُس کی گود میں بیٹھا راج کمار اب ڈھول کے پول کی طرح اُس کے سامنے لڑھک رہے تھے۔ آج اس کا دِل قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ وہ پچھلی کوٹھری میں جا کر ایک چارپائی پر ٹوٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رات اُسے

زبان گذارنی پڑی۔ گیت۔ شادیانے اور عورتوں۔ بچوں کا ہنسی مذاق اُسے زہر کی طرح کڑوا لگ رہا تھا۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر وہ بالکل خاموش پڑا رہا۔

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی۔ جب اُس کی ماں نئی دُلھن اور مہمانوں کو سُلانے کے بعد اُس کوٹھری میں آکر لیٹ گئی۔ دُولھا بھائی پہلے ہی آکر سو گیا تھا۔ نہ بھائی نے اُسے بُلایا نہ ماں نے۔ اُس کے دل پر چھُریاں سی چلنے لگیں اور دل کا گرم گرم لہُو اُس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔

"یہ لوگ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟ محض اس لئے کہ میری زبان اچھی طرح نہیں چلتی؟۔ جو کچھ میں دیکھتا اور سُنتا ہوں اُسے فراٹے سے زبان پر نہیں لا سکتا!۔ اس کے علاوہ اور کیا بُرائی یا عیب ہے مجھ میں؟۔ یہ میری ماں۔۔ جس نے مجھے جنم دیا اور جس کے گوشت۔ پوست کا ہی جزو میں ہوں۔ اُس ماں نے بھی مجھ سے مُنہ موڑ لیا ہے۔ آخر کیوں؟۔ میں نے کیا جُرم کیا ہے؟...... اگر میری ماں مجھ سے بیزار ہے تو کسی اور کو کیا دوش دیا جائے!"......

یہ سوچتے سوچتے اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔۔۔ "کسی پر بوجھ بن کر جینا بھی کوئی زندگی ہے؟۔ مجھے تو پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہئیے تھا۔۔۔! اچھا اب بھی۔۔۔ اس زندگی سے موت بدرجہا بہتر ہے۔" گرم گرم آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل کر کانوں کے پاس سے بہتے ہوئے چارپائی کی رسیوں میں جذب ہونے لگے۔ وہ مرنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔۔۔ گاڑی کے نیچے آکر؟...

... نہیں۔ نہیں ..." اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہوٹل کے سامنے کا ایک ہولناک واقعہ اُسے یاد آ گیا ... گاڑی کے نیچے آئے ہوئے ایک بدنصیب کی لہو میں لت پت لاش ... جس کی ہڈی پسلی چور چور ہو چکی تھی ... سوچتے سوچتے اُس کا جسم بھی کانپ اُٹھا۔"

تو پھر کنویں میں کود مروں ؟" کسی گہرے کنوئیں کی سطح پر تارے کی طرح چمکتا ہوا پانی اُسے دکھائی دینے لگا ... اور اُس کے ساتھ ہی ہوٹل میں بیٹھے ایک گاہک کی بات یاد آ گئی جو اپنے ساتھی کو بتا رہا تھا۔ کہ جس عورت کی لاش پرسوں کنوئیں سے اُتار ہوئی تھی۔ اس کی طرف دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ لاش منشکیزے کی طرح پھول گئی تھی اور بدبو ......"

اُس کا ننھا سا دل کانپ اُٹھا۔ " تو پھر کیا کروں ؟" بڑی بے چینی سے لڑکھڑاتے ہوئے الفاظ اُس کے مُنہ سے نکلے۔

کروٹ بدلتے ہی اُس کے کانوں میں مدھم سی آواز آئی۔ وہ دھیان لگا کر سُننے لگا۔ ماں اور بھائی اُسے سویا ہوا سمجھ کر باتیں کر رہے تھے۔ " کچھ تو بخشش۔ بدھائی میں خرچ ہو گئے۔ باقی پچاسی گاڑی کا کرایہ دے دیا۔ اب مشکل سے دو۔ چار روپے ہی بچے ہوں گے ..." بھائی کہہ رہا تھا۔

" لیکن کل دُلہن کے ساتھ آئی عورتوں کو وداع کرنے میں چالیس۔ پچاس اور خرچ ہوں گے ... لیکن میرے پاس مشکل سے دس۔ بارہ روپے ہی ہوں گے۔" ماں بیچ میں ہی بول پڑی۔

"میں بھی اسی سوچ میں پڑا ہوں۔ ہم نے پہلے ہی اُدھار مانگ، مانگ کر گھر گھر "کالا" کر دیا ہے۔ اور قرض کون دے گا ہے۔ اور جو لیا ہے وہ ادا کیسے کیا جائے گا؟"

ماں نے جھنجھلا کر کہا۔ "یہ وقت کسی طرح نکالو۔ قرض چکانے کی سبیل میں نے سوچ لی ہے۔ چنّو کی بندھی بندھائی تنخواہ دے دیا کریں گے۔ اس جمعدار نے حساب تھوڑے ہی مانگنا ہے۔"

چنّو اور جمعدار ـــــ اپنا اصل نام اور لقب آج اس نے پہلی بار ایک ساتھ سُنے۔ اور ماں کی پریشانی اور نیت اُس پر واضح ہو گئی۔ پھر بھی اُس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل اُٹھی "میری نہ سہی۔ میری کمائی کی تو اُن کو ضرورت ہے نا؟۔ آخر میری زندگی بیکار تو نہیں!۔ پھر میں مرنے کی بات کیوں سوچ رہا ہوں ہے۔ مجھے تو زندہ رہنا چاہیئے۔"

اُس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اُس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ ہونٹوں کو زور سے دبا کر اُس نے دل میں کہا۔" او چنّو! تُو جس زندگی کو بیکار بوجھ سمجھ رہا ہے۔ اُسی زندگی پر تو یہ لوگ آس لگائے بیٹھے ہیں ـ ـ ـ ۔ چل اپنے لئے نہ سہی۔ ان کیلئے ہی زندگی کا کڑوا گھونٹ پی جا!"

اب اُس کی رگ رگ میں جوش سرسرانے لگا۔ اُسے یُوں محسوس ہوا۔ کہ زندگی ہر طرف ناچ رہی ہے۔ چہچہا رہی ہے۔ سوچتے۔ سوچتے وہ تصوّر کی دُنیا میں کھو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ مخملی گدّے پر لیٹا ہوا ایک بادشاہ ہے۔ جب

کے محل کے دروازے پر نوٹ بانٹے جا رہے ہیں وہ شاہانہ شان سے بھک منگوں کی طرف دیکھتا ہے۔ گداگروں کی صف میں اُسے اپنا بھائی بھی ہاتھ پسارے کھڑا دکھائی دیتا ہے......
اِن ہی خیالات میں اُبھرتے۔ ڈوبتے نہ جانے کب اُسے نیند آ گئی۔

صبح وہ جلدی ہی بیدار ہو گیا۔ ایک نظر اُس نے کمرے میں دوڑائی۔ ماں۔ بیٹیا ابھی تک سو رہے تھے۔ اُس نے جیب سے بٹوا نکالا۔ اُس میں پانچ۔ پانچ روپے والے دس۔ گیارہ نوٹ تھے۔ تمام نوٹ اُس نے ماں کے پاؤں کے پاس رکھ دیئے اور بٹوے کو چھاتی سے لگا کر وہ کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

گاڑی میں بیٹھا ہوا ہنستا ہنستا وہ واپس آ رہا تھا۔ اپنے اُس گھر کی طرف جہاں راکھ کے "کھنڈرچے" اور جُوٹھے برتن اُنکی راہ دیکھ رہے تھے۔

از
پروفیسر رام ناتھ شاستری:۔

اکھنڈ پاٹھ

سردار منگل سنگھ کی نئی کوٹھی میں ہونے والا ایک ہی سال میں یہ تیسرا اکھنڈ پاٹھ ہے۔ پہلا پاٹھ اُس نے یہ عالی شان کوٹھی بنوانے اور اُس میں آکر اپنے اکلوتے بیٹے سردار دلیپ سنگھ کی "ارداس" میں بٹھایا تھا۔

نئی عالی شان کوٹھی۔ جس میں اُس کا ہونہار نوجوان بیٹا ایک لکھ پتی کی پری پیکر بیٹی بیاہ کر لایا تھا۔ اسی خوشی میں وہ پہلا اکھنڈ پاٹھ ہوا تھا۔ اُس پاٹھ کے وقت اُسی نئی کوٹھی کے اندر۔ باہر خوشیاں رقص کر رہی تھیں۔ بسنت رُت جھلملا رہی تھی۔

لاؤڈ سپیکر پر گوردوں کی پوتر بانی گونج رہی تھی۔ صحن میں نئے سائبان کھڑے تھے۔ پاس پڑوس کے نوجوان جگہ جگہ بیٹھے تھے۔ کاروباری لوگ "بانی" تو بھی سُن رہے تھے اندر بیچ بیچ

میں اپنے کاروبار کا چرچا بھی کر رہے تھے۔

ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ۔ جوان قہقہے۔ لوگوں کی گھٹتی بڑھتی بھیڑ۔ مبارک بادیں۔ بدھائیاں۔ پھولوں کے ہار اور قیمتی چوکھٹوں میں جڑھی ہوئی گوروؤں کی خوبصورت تصویریں۔ ہر چیز پر نکھار تھا۔ ہر چیز سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

اور سردار منگل سنگھ! وہ خوشی کے نشہ میں کس قدر مست تھا۔ دلیپ سنگھ اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ ڈرائینگ روم میں گپ شپ کر رہا تھا۔ اُس کے دوست اُس کی شادی کے فوٹو گرافوں کا البم دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

لکھ پتی بابو کی بیٹی جیت کور ریشمی کپڑوں اور زیورز میں چمکتی۔ جھکتی سسرال کی نئی سہیلیوں میں گھری ہوئی تھی۔ اور اُن کی ہنسی مذاق کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہی تھی۔ عورتیں اُسے دیکھ دیکھ کر دانتوں تلے اُنگلی دبا لیتیں۔ واہ گورو! واہ گورو!! کوئی جیت کور کی کوئی دلیپ سنگھ کی قسمت کو سراہتی۔ مگر عام لوگ اِس بات پر متفق تھے کہ سردار منگل سنگھ جیسے خوش قسمت لوگ اِس دُنیا میں بہت تھوڑے ہیں۔ پہلا اکھنڈ پاٹھ اسی ہنسی خوشی میں ختم ہُوا۔

دُوسرا اکھنڈ پاٹھ آج سے لگ بھگ چار ماہ پہلے ہُوا تھا۔ سردار منگل سنگھ کے اُسی اکلوتے بیٹے کے "تیرہویں" پر۔ شادی کے سات۔ آٹھ ماہ بعد ہی کسی نے دلیپ کو گولی مار کر اُس گھر کا چراغ ہی گُل کر دیا۔ یہ اکھنڈ پاٹھ مرحوم کی رُوح کی

شانتی کے لئے بٹھایا گیا تھا۔

آج اِس کوٹھی کی شان آنکھوں میں چبھتی تھی۔ ہر طرف اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ہر چیز ڈری۔ سہمی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ آج کاروباری گفتگو اور بحث مُباحثے خاموش تھے۔ جوانیاں کُملائی ہوئی تھیں۔ حُسن سہما ہُوا تھا اور بڑھاپے کی نظروں میں دُھند اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

لاؤڈ سپیکروں پر گونجتی گُروؤں کی پوتر بانی ہی اُس ماتمی ماحول میں نڈر دکھائی دیتی تھی۔ اِس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اِس پوتر بانی کو زندگی کے دھارے کی تمام حقیقت معلوم تھی۔ اِس دھارے کے دونوں کناروں کو۔۔۔ زندگی کے کنارے اور موت کے کنارے کو بھی یہ بانی اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اِنسانی نظر اِدھر، ماحصل سے محروم ہے۔ وہ جب ایک کنارے کو دیکھتی ہے تو دوسرا کنارا اُس کی پہنچ سے دُور پرے ہوتا ہے۔ زندگی کے ساحل سے اِس دھارے کی لہروں پر بہتے۔ جگمگاتے چراغوں کو ان کی سنہری پرچھائیوں کو جب یہ نظر دیکھتی ہے تو اندھیرے میں ڈوبا ہُوا دوسرا کنارا اُسے دکھائی نہیں دیتا جہاں پہنچتے پہنچتے یہ چراغ بجھ جائیں گے۔ اندھیرے میں سما جائیں گے۔

اور جب کبھی یہ اِنسانی نظر موت کے ساحل پر پھیلے اندھیرے میں پھنس جاتی ہے تو اِنسان کانپ اُٹھتا ہے۔ اُس کے "نین پرائے" سب اُس دم گھونٹنے والے اندھیرے میں سہم سِمٹ جاتے ہیں۔ اِسی لئے پہلے اکھنڈ پاٹھ کی امرت بانی اُس کوٹھی کے قہقہوں اور کاروباری شوروغل کے اُوپر ہی اُوپر نیلے آسمان پر جا کر گونجتی رہی اور دوسرے

'پاٹھ' کے موقع پر بھی یہ 'بانی' اس کوٹھی پر چھائی ہوئی اداسی اور آنسوؤں۔ آہوں اور سوگوار خاموشی کو تار تار نہ کر سکی۔ کوٹھی کے پاس سے گذرتے ہوائی روشنوں پر بیٹھ کر اُس بانی کے شبد نیلے آسمان پر جاکر بکھرتے رہے۔

دوسرے 'پاٹھ' کے بعد کے ان چار مہینوں میں سردار منگل سنگھ کی یہ کوٹھی ایک ماتم کدہ بن گئی۔ جہاں ہر وقت ایک دردناک بس بھری اداسی چھائی رہتی تھی۔ ایسا جان پڑتا کہ یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ ہاں رہائش رکھنے والوں کی کبھی کبھی نشان دہی ہوتی تھی۔ اُن جیپ کاروں اور موٹروں سے جن پر سوار ہوکر کبھی کوئی پولیس افسر یا سردار منگل سنگھ کی طرف سے قتل کے مقدمہ کی پیروی کرنے والا کوئی وکیل یا بیرسٹر آتا یا پھر منگل سنگھ کے علاج معالجہ کے لیئے کوئی ڈاکٹر آتا۔

لوگوں کو اپنے متعلق چاہے سینکڑوں فکر اور پریشانیاں ہوں۔ دوسروں کی پریشانیوں میں اظہار ہمدردی کرنے اور دوسروں کے معاملات میں دخل انداز ہونے کے لئے انہیں وقت مل ہی جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اتنی بڑی کوٹھی کا اب کیا ہوگا؟۔ غم زدہ بیچارا منگل سنگھ تو موم بتی کی طرح گھٹتا پگھلتا چلا جا رہا ہے۔ اُس کے کلیجے کا یہ گہرا زخم اس کی شمع حیات کو اور کتنے دن تک جلنے دے گا!۔ اُس کے بعد کیا ہوگا؟۔ سردار منگل سنگھ کی سرداری کو بھی زہر کے گھونٹ پی پی کر آخر کتنے دن جینا ہے!

لوگوں کو زیادہ ترس آتا تھا۔ دلیپ کی نوجوان بدنصیب بیوہ جیت کور پر جس کی اداس جوانی اور غم سے مرجھائے حُسن کی کہانیاں وہ ہر روز سُنتے سُناتے تھے۔ لوگ کہتے "اب وہ کیونکر رہے گی اِس دم گھونٹنے والے سوگوار مقبرے میں! اِس کا لکھ پتی باپو اُسے ہر دم کڑھنے۔ دُکھنے کے لئے اُسے یہاں کیوں رہنے دے گا؟ ۔۔۔ سنتے ہیں اِس کوٹھی سے زیادہ سربلند اُس کی اپنی تین۔ چار کوٹھیاں ہیں۔ جیت کور کا ایک بھائی بہت بڑا ٹھیکیدار اور دوسرا فوج میں کرنل ہے۔"

کچھ لوگ یہ بھی کہتے سنے گئے۔ "جیت کور کے والد نے ملک کے بٹوارے کے بعد دلی آکر ایک ڈھابہ چالو کیا تھا۔ جو آج "لبرٹی" ہوٹل کی شکل میں کھڑا اُن لوگوں کی ہنسی اُڑا رہا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ تقدیر کوئی شے نہیں۔"

ایک بزرگ نے تائید کرتے ہوئے کہا تھا۔ "بنا تقدیر کے بھلا وہ تدبیریں کچھ کرتی بھی ہیں جن سے دولت کے چشمے پھوٹتے ہیں؟"

لیکن تقدیر کبھی کبھی کرم فرما ہوکر بھی آدمی کو دغا دے جاتی ہے۔ جیسے اُس نے منگل سنگھ اور اُس کے بیٹے کو دیا۔

دلیپ سنگھ نے بی۔ اے پاس کیا تو منگل سنگھ نے ٹرانسپورٹ کا اپنا سارا کاروبار اُسے سونپ دیا۔ دلیپ کی اُمنگیں جوان تھیں اور کاروبار پہلے ہی پختہ بنیادوں پر کھڑا تھا۔ اس لئے سات۔ آٹھ ہزار کی بندھی بندھائی آمدنی ضرور تھی۔ لیکن جیسی کہ کہاوت بھی ہے پیسے سے پیسے کی ہوس اِس طرح بڑھتی ہے جیسے نمکین پانی پینے

سے پیاس بڑھتی ہے۔

ایک عام آدمی جن باتوں سے اپنے لئے دھرتی پر ہی جنت کی تخلیق کر سکتا ہے وہ سب باتیں سردار منگل سنگھ کے سامنے دست بستہ کھڑی تھیں۔ دولت۔عزت۔ فرمانبردار بیوی۔ قابل ہونہار بیٹا۔۔۔ ۔ سردار کا جسم ذرا سے بھاری ہو چلا تھا۔ اُس کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ لیکن شراب کی بدولت اُس کے چہرے کی لالی اب بھی جوانوں کو شرمندہ کرتی تھی۔

دلیپ جوان تھا۔ وہ سوچتا۔ یہ سب والد صاحب کی کمائی ہے۔ اَن پڑھ۔ سوجھ بوجھ کی کمائی!۔ اُس کی اعلےٰ پڑھائی کس کام کی اگر وہ اِس سے ڈیوڑھی۔ دگنی کمائی نہ کر دکھائے!

اُس کے ایک رشتہ دار نے ایک بار اُسے ٹھیکیداری کے کام میں اپنے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دی تو دلیپ نے حقارت سے کہا تھا۔" اب ٹکے ٹکے کے اوورسیروں اور کلرکوں کو بندگی کرواؤ گے مجھ سے؟۔ میری جوتی۔۔۔۔ ۔۔۔ بھائی صاحب کام وہ کیا جائے جس میں گردن نہ جھکانی پڑے۔ کسی کی خوشامد نہ کرنی پڑے۔

سچ پوچھو۔ تو مجھے یہ ٹرانسپورٹ کا دھندا بھی پسند نہیں ہر سال اِن گاڑیوں کو پاس کرانے کی زحمت اور افسروں کی نازبرداریاں یہ بھی تو ذلت ہے۔۔۔۔"

نوجوان ٹرانسپورٹر اُس کی ایسی ایسی باتیں سن کر دلیپ سنگھ کو اپنا لیڈر سمجھنے لگے تھے۔ وہ سوچتے یہ انقلاب لانے والا لیڈر ہر پایا!

ہؤا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ جس طرف بھی رُخ کرے گا کامیابی اِس کے قدم چُومے گی۔

دلیپ کئی بار اپنے ساتھیوں کی باتوں پر ہنستا ہُوا کہتا۔ " مَیں ہندوستان میں اِتنی دیر تک ہی رہوں گا۔ جب تک کہ میرے پاس اپنا آٹھ۔ دس لاکھ روپیہ جمع نہیں ہو جاتا۔ والد صاحب کے روپے کو مَیں اُن کی امانت سمجھتا ہُوں۔۔۔۔ اِس پر سردار صاحب کے پوتوں کا حق ہو سکتا ہے میرا نہیں۔ والد صاحب چاہیں تو یہ جائیداد غربا میں بانٹ دیں یا کسی گوردوارے کو دان میں دے دیں۔۔۔۔"

سردار منگل سنگھ کو اِن باتوں کی بھنک لگتی تو وہ ہنس کر کہتے۔" لوگوں کو بیوقوف بناتا ہے۔ جوانی کے جوش میں بڑھ ہانکتا ہے۔۔۔ لاکھوں کی کمائی پر بیٹھا کوئی بھی نوجوان اس طرح بہک سکتا ہے۔۔۔۔ اُس کی ابھی عمر ہی کیا ہے!"۔ یہ سردار منگل سنگھ کی ظاہر داری تھی۔ کیونکہ دل میں وہ یُوں سوچا کرتے۔" دلیپ جیسے ہوشیار بچوں میں ایسی اُمنگیں اُبھرنی ہی چاہئیں۔ ترقی کی نئی راہیں کھوجنا بُرا نہیں۔ سچی زندگی یہی ہے۔۔۔ آخر بیٹا کس کا ہے؟۔ مَیں نے بھی یہاں آ کر سو روپے ماہوار کی ڈرائیوری سے چل کر یہ کہانی یہاں تک پہنچائی ہے۔ وہ قدرتی طور پر مجھ سے زیادہ تیز چلنے کی سوچتا ہے۔۔۔۔"

ایسا جان پڑتا تھا کہ دلیپ سنگھ نے اپنے ارادے پُورے کرنے کی کوئی راہ نِکال لی ہے۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے شاہدرہ میں

لاکھ روپیہ کما لیا۔ لیکن کہاں سے ؟۔ کسی کا روبار سے ؟۔ اُس کے کچھ خاص ساتھی بھی دیکھتے دیکھتے مالدار ہو گئے تھے۔ اِس کا چرچا " ویوکا " ندی کے بہاؤ کی طرح ویسے تو ریتلی سطح کے نیچے چلتا۔ لیکن جہاں کسی نے کرُید کر تھوڑا سا گڑھا کھودا کہ " پانی " نمودار ہو جاتا۔

ٹرانسپورٹروں میں کچھ لوگ زندگی کا تجربہ رکھنے والے زیرک بزرگ بھی تھے۔ اُن کا ماتھا ٹھنکا ا۔ ایک دن اُن میں سے ایک نے کہا۔" اس طرح اندھیری گلیوں سے جو دولت آتی ہے وہ گھر بساتی نہیں بلکہ بستے۔ بستے گھروں کو اُجاڑ دیتی ہے۔ دلیپ اب کسی کو بھی گرہ نہیں باندھتا۔ یہ لچھّن اچھے نہیں۔ ایسا نہ ہو کہیں باپ کی کمائی بھی 'کوڑ' ہو جائے "۔

کچھ لوگوں کو شک تھا کہ دلیپ سٹّے بازی کرتا ہے۔ دلیپ کو کسی نے یہ بات سنائی تو وہ ہنس کر کہنے لگا۔" جلنے ہیں۔ سالے! جلنے دو۔ انہیں۔ "

ایک قیاس یہ بھی تھا۔ کہ دلیپ شراب بناری والے "خشک" علاقوں کو "سیراب" کرتا ہے۔ تبھی تو ہفتہ ہفتہ بھر کہیں غائب رہتا ہے۔ لیکن یہ سب قیاس آرائیاں اُس دن جھوٹی ثابت ہوئیں جس دن لوگوں نے یہ سنسنی خیز خبر سُنی۔ کہ پاکستانی بارڈر پر اُس پار کے سمگلروں کے ساتھ " کاروبار" کرنے گئے ہوئے دلیپ کو کسی سرحدی محافظ نے گولی مار دی۔

دلیپ کی لاش پوسٹ مارٹم کیلئے ہسپتال پہنچی تو سارا

شہر والا جمع ہو گیا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک آدمی نے ادھر ادھر دیکھ کر دبی زبان سے کہا۔ "سنا ہے اس پار کی گولی سے تین آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔ دو پاکستانی اور ایک دلیپ سنگھ..." ۔ دوسرے نے تردید کی۔ "نہیں نہیں یہ ہسپتال کے آدمی سے سنا ہے کہ واقعہ بارڈر سے چار پانچ میل پیچھے ہے۔ قتل ذاتی عداوت کی بنا پر ہوا ہے۔" ایک طرف سے یہ آواز بھی سنائی دی کہ اس جنگل بارڈر کے پاس کے "بیلے" میں سور بہت پائے جاتے ہیں۔ ان کے شکار پر گئے ہوئے کسی اپنے ہی شکاری کی گولی اندھیرے میں اسے آ گئی ہے ....

وجہ چاہے کچھ بھی تھی نتیجہ سب کے سامنے تھا۔ سردار منگل سنگھ کا اکلوتا نوجوان بیٹا دلیپ سنگھ قتل ہو چکا تھا۔ اور ایک نوجوان لڑکے اور اس کے بوڑھے باپ کو پولیس نے حراست میں لے لیا تھا۔ اے۔ ڈی۔ ایم کی عدالت نے باپ بیٹے دونوں پر فرد جرم عائد کر کے انہیں سیشن سپرد کر دیا۔ سردار منگل سنگھ نے بیٹے کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے ان چار مہینوں میں روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ سیشن جج کی عدالت میں استغاثہ کی پیروی کرنے اور سرکاری وکیل کی مدد کیلئے اس نے باہر سے ایک بیرسٹر بلایا تھا جو چار پیشیوں کیلئے کئی ہزار روپے محنتانہ لے گیا تھا۔

تھوڑے دنوں میں مقدمہ قتل کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اس لئے سردار منگل سنگھ نے اسی حال کے دوران یہ "تیسرا اکھنڈ پاٹھ" بٹھایا ہے۔ اسے اپنی دولت۔ اپنے اثر و رسوخ پر جو تھوڑی بے یقینی ہو سکتی تھی اسے دور کرنے کیلئے سردار صاحب نے ایشور کی مدد حاصل کرنے کیلئے یہ سبیل سوچی ہے۔

عدالت میں معاملہ لگ بھگ صاف ہو چکا تھا مگر ایک بات جو استغاثہ کے وکیلوں کو پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ دونوں ملزم ایک دوسرے کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ باپ سارا الزام اپنے سر اور بیٹا اپنے سر لے رہا تھا۔ اب بیٹے کا بیان

پرتوں کی ذات

ہی بیان تھا۔ کہ "وہ اُس علاقے کا بارڈر سکاؤٹ ہے۔ مقتول اور اُس کے ساتھی بارڈر پار کے لوگوں کے ساتھ چوری چھپے لین دین کرتے تھے۔ اُس رات بھی یہ لوگ بارڈر کے پاس جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ٹارچ سے اشارے کر رہے تھے کہ میں نے انہیں دیکھ لیا۔ جس وقت پاکستانی سمگلروں کے آنے کی آہٹ ملی تو میں نے اندھیرے میں ہی اُن پر فائر کردیا۔ میری گولی اُنہیں نہیں لگی۔ پھر ان لوگوں نے جواباً دو تین فائر کئے۔ میں نے اپنے بچاؤ کیلئے اندھیرے میں ہی طرف اندازے سے گولی چلائی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اُن کا ایک ساتھی .... یہی سردار گر پڑا ہے۔ اس کے باقی ساتھی پہلے اِدھر اُدھر بھاگے پھر مقتول کو اُٹھا کر لے جاتے معلوم پڑے ...."

بیٹا باپ کو بچانا چاہتا تھا اور باپ بیٹے کو۔ پولیس اور استغاثہ کے وکیلوں نے اسے ایک قانونی معاملے کے دوسری شکل دے دی تھی۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ واردات بارڈر سے چار۔ پانچ میل اِس طرف "اُس بیلے" میں ہوئی۔ جہاں یہ لوگ شکار کھیلنے گئے تھے قتل اتفاقیہ نہیں ہوا بلکہ جان بوجھ کر کیا گیا تھا۔ جس کی وجہ تھی ایک دیہاتی عورت سے چھیڑ چھاڑ۔ استغاثہ نے دلیلیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ چلتی جیپ میں بیٹھے آدمی کو گولی سے مار دیا۔ یہ کام اِس بوڑھے شکیلے کا نہیں ہو سکتا۔ اصل قاتل اُس کا بیٹا ہی ہے۔ استغاثہ کی طرف سے پوری کوشش ہو رہی تھی کہ بوڑھے کا نوجوان بیٹا ہی پھانسی پر چڑھے۔ بیٹے کے قتل کا بدلہ بیٹے سے۔ اسی کوشش کی مزید تقویت دینے کیلئے ہی یہ "تیسرا" "اکھنڈ پاٹھ" بٹھایا گیا تھا۔ سردار منگل سنگھ کے ڈاکٹروں کا بھی اس "پاٹھ" میں کچھ ہاتھ تھا۔

ان چار مہینوں سے سردار منگل سنگھ نے بے حد شراب پینی شروع کر دی تھی۔ جس وقت بھی دلیپ کی یاد اُسکے کلیجے کو کریدتی تو شراب ہی سے اُسے سہارا ملتا تھا۔ لیکن اس کثرت شراب نوشی سے اُس کا جسم اندر ہی اندر جلنے لگا۔ ڈاکٹروں

کو ڈر تھا کہ اگر سردار صاحب اسی شرارت سے شراب پیتے رہے تو ایک دن اچانک ہی اُن کے دل کی دھڑکن بند ہو جائیگی یا ان پر فالج گرے گا یا دماغ کی نس پھٹ جائیگی .... لیکن منگل سنگھ مجبور تھا۔ ڈاکٹروں نے اس "پاٹھ" کا مشورہ اسی لئے دیا تھا کہ آدمی کو سب سے بڑا اور آخری واسطہ۔ سب سے زیادہ کارگر دوائی پرمیشور کی ہی دی جا سکتی ہے۔ پاٹھ کے دوران شاید سردار صاحب شراب پینا کم کر دیں یا ہو سکتا ہے کہ پینا ہی چھوڑ دیں۔ اگر وہ بیس دن اس سے دور رہے تو شاید اس موذی سے نجات ہی حاصل ہو جائے۔ ڈاکٹروں کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ گوروؤں کی لوزبانی سے بھی سردار صاحب کے مجروح دل کو ضرور ہی تسکین ملے گی۔ سردار منگل سنگھ کے دوستوں کو یہ دیکھ کر بڑی حیرانی اور مسرت ہوئی کہ اس پاٹھ سے اُسے واقعی سکونِ قلب حاصل ہو رہا ہے۔ کمزوری کی وجہ سے وہ بیچارا بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس لئے برآمدے میں بستر پر لیٹے لیٹے ہی بڑی عقیدت سے "گروبانی" کو سنتا رہتا تھا۔ بانی کا ایک ایک شبد اُس کے دل کو چھو لیتا تھا اور کوئی کوئی بول تو کتنی دیر تک اُس کے کانوں میں اُس کے من کے اندر گونجتا رہتا۔

سے۔" لینراں۔ دوہعت۔ مال دھن چھانڈی چلے اتی بھائی
سنگی ناں کوئی نانکا۔ اوہ دیسی اکیلا جائی"

منگل سنگھ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے من کے اندر ہی یہ بچن پھر دُہرایا۔ پھر دُہرایا اور تیسری بار دُہراتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ گھبرا اٹھا "گورو نانک کیا کہتے ہیں اور میں آج تک کس راہ پر چلتا رہا؟"۔ اُسے یاد آگئے ۱۹۴۷ء کے وہ لرزا دینے والے ایام جب ملک کا بٹوارا ہوا تھا۔ وہ اپنا آبائی گھر، گاؤں چھوڑ کر اپنی گھر والی اور دلیپ کو لیکر جنگل میں چھپا بیٹھا تھا۔ موت گدھوں کی طرح آسمان پر منڈلا رہی تھی ... منگل سنگھ کو پھر جھٹکا محسوس ہوا۔

گرنتھی کے بول پھر کانوں میں پڑنے لگے:-

"بردہ بھیٹو آج ہو نہیں سمو جھے۔ کون کمنتی آرچھانا ۔ ۔ ۔"

اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُسے محسوس ہوا کہ "سچے گُرو" اُسے جھنجھوڑ کر سمجھا رہے ہیں۔ ارے منگل! تو بڑا ہی اگیہ وان ہے۔ آج گُرو تجھ پر مہربان ہیں۔ تجھے ہوش میں لا رہے ہیں یہ ذرّہ کیسی خوش قسمتی کہ اور وہ بھی شاذ و نادر ہی ملتا ہے"۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر ماتھے سے لگائے اور روتا روتا گرنتھ صاحب کی چوکی کے سامنے آ بیٹھا۔ پاٹھ سُننے والے تمام مرد و زن کے دل بھی بھر آئے "ہے نرنکار! بیٹے کی جدائی کا داغ دشمن کو بھی نہ لگے۔ پرماتما کے کھیل بھی کیسے نرالے ہیں۔ دُنیا بھر کے عیش و آرام سہنے کے بعد بیچارے پر کیسی بپتا آن پڑی! - اس سے تو مفلسی ہی اچھی ۔ ۔ ۔" دوسرے دن بھی پاٹھ سُنا۔ پھر کھانا کھا کے سردار منگل سنگھ برآمدے میں لیٹا لیٹا گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ اُسے وہی جنگل یاد آ رہا تھا۔ ایک ایک بات سامنے آ رہی تھی۔ وہاں سے اُسے بچایا تھا ایک ڈوگرہ پلٹن نے۔

گُرو مہاراج کی امرت بانی پھر یاد آ گئی:-

"بردہ بھیٹو آج ہو نہیں سمو جھے۔ کون کمنتی آرچھانا ۔ ۔ ۔" گویا اُسے ایک چابک اندر لگا۔ یادوں کے قافلے آگے بڑھے۔ بڑھتے چلے گئے۔ اِدھر موت کا ڈر، اُدھر جینے کی تمنا۔ اس وقت دلیپ کی عمر ۵ یا ۶ سال کی تھی۔ سات دنوں کی بھوک پیاس نے جوانوں کو بھی بے حال اور ڈھال کر دیا تھا۔ اس معصوم کی بھلا اوقات ہی کیا تھی۔ ہم ڈر رہے تھے کہ اس کی رونے کی آواز کہیں دشمن نے سُن لی تو ۔ ۔ ۔ ؟ میں غصّے میں اُس کا گلا گھونٹنے ہی لگا تھا کہ سردارنی نے گُرو کا واسطہ دے کر روک دیا تھا۔ پھر اُن ڈوگرہ سپاہیوں نے آ کر ساری کارروائی سنبھال لی اور کھانے کو دیا۔ نہیں کیوں جان پڑا کہ پرمیشور

نے ہماری بیکار سی کرسی اِن فرشتوں کو کہ ہماری مدد کیلئے بھیجا ہے۔ گورو کی پوتر بانی بھی تو مجھے وہی دن یاد کرا رہی ہے۔۔۔" سردار منگل سنگھ کی ڈھارس بندھانے لگی تو وہ بولا "دلیپ کی ماں! یاد ہے تجھے وہ دن؟ چار پانچ سو مردوں عورتوں کا وہ قافلہ۔ دلیپ کو باری باری سے اٹھا کر ہم دونوں اُس قافلے کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرتے۔ یاد ہے نا وہ فوجی جمعدار کتنا نیک دل آدمی تھا کس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس کے فوجی سپاہی ہماری حفاظت کر رہے تھے۔ دلیپ کو اور دو چار کمبل اٹھا کر چلنا کس قدر مشکل تھا تو نے کہا تھا۔ یہ کمبل پھینک دیتے ہیں۔ لیکن میں نے سوچا کہ کمبلوں کے بنا ہم ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ قافلے والے ہمیں تھکے ہارے دیکھ کر بھی ہمارے پاس سے ہو کر گذر رہے تھے۔ اُن میں دوست بھی تھے اور رشتہ دار بھی لیکن کسی نے آنکھ نہ ملائی بھلا ملاتے بھی کیسے؟ زندگی اور موت میں فرق ہی کتنا رہ گیا تھا دلیپ کی ماں! اُس وقت ہم نے مالک کو یاد کیا تھا اور پھر دیکھی تھی تو نے اُس کرتار کی مایا۔ ہے سے "جا رن تیرو کوئی ناہیں۔ تا دن رام سہائی۔۔۔" واہ گورو۔ واہ گورو تیری اوٹ۔ ہم سوچتے تھے کہ دلیپ کسی طرح بچ جاتا تو خاندان کا نام زندہ رہ جاتا۔ لیکن۔۔۔ا۔ دلیپ کی ماں۔ اُس وقت وہی ڈوگرہ جمعدار ہمارے پاس آیا تھا۔ مجھے آج تک اُس کے الفاظ یاد ہیں "ہمت کرو سردار جی۔ بس یہی چار پانچ میل خطرے کے ہیں۔ آگے اپنا وطن ہے۔ اپنے لوگ ہیں۔۔۔" اُس جمعدار نے دلیپ کو خود اٹھا لیا۔ اس دلیپ کو جس کے بدلتے ہوئے کپڑوں سے بدبو آ رہی تھی۔ اُس نے ہمیں اُس جگہ پہنچا دیا جہاں زندگی کی امید کچھ چمکنے لگی تھی۔ کیسے دن تھے وہ۔" منگل سنگھ نے تولیے سے آنسو پونچھے اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ اُس نے آنکھیں موند لیں۔ یادوں کا قافلہ بڑی تیزی سے اُس کے دماغ پر کئی تصویریں بناتا، مٹاتا چلا جا رہا تھا۔ سترہ اٹھارہ سال میں اُس نے اتنی بڑی جائیداد کس طرح بنائی۔ اِس کیرالفت کے سارے داؤ پیچ۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے۔ اُس نے سوچا کہ وہ ڈوگرا جمعدار، بیچارا تیس پینتیس روپے ماہوار پنشن لیکر کسی گاؤں میں پتہ نہیں کس طرح اپنے

دن کاٹ رہا ہوگا؟ میں نے اُس کے ساتھ "منتری" کی تھی۔ دونوں منہ بولے بھائی بنے تھے میں نے اُسے یقین دلایا تھا کہ میں اُس کے احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ مگر بعد میں میں نے اُسے کبھی یاد نہیں کیا۔ محض اس لئے کہ میں امیر ہو گیا تھا۔ میں یہ گورو بانی ہر روز پڑھتا دہراتا تھا ؎ "سمرن بھجن دیا نہیں کیتی۔ تو ملکھ چوٹا کھائے گا"۔ میں نے ایک دن بھی اس امرت بانی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔" وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ "بھولی سردارنی! تو نے بھی مجھے نہیں سمجھایا۔ اری تو خود میرے ساتھ ہی اس طلسم میں پھنس گئی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ آج ست گرو ہم پر مہربان ہے۔ آج اُس نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ داتا۔ سارا قصور میرا ہے یہ میرے ہی گناہوں کی سزا ہے زندگی میں آج پہلی بار گورو مہاراج کی بانی میری سمجھ میں آئی ہے۔" بابا گرنتھی کی آواز لاؤڈ سپیکر پر پھر گونجی۔

"جا دن تیرو کوئی نا ہیں۔ تا دن رام سہائی"۔ "سُنا تو نے بھاگوان؟ وہ دیالو اب بھی دستگیری کیلئے تیار ہے۔ آج ایشر رام مجھ پر کتنے مہربان ہیں۔ مگر انہوں نے یہ مہر و کرم کیا۔ کہاں آکر؟ پہلے مجھے کیوں خبردار نہ کیا؟ چلو پھر بھی کرتار کی بڑی مہر ہے اب کوئی ڈر نہیں۔ دلیپ کی ماں۔ کوئی ڈر نہیں!" کوٹھی میں جمع دوست رشتہ دار منگل سنگھ کی یہ باتیں سُن کر گھبرا اٹھے۔ اگلی صبح انہوں نے شہر کے بڑے ڈاکٹر کو بلوایا۔ جب ڈاکٹر وہاں پہنچا۔ تو منگل سنگھ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر بڑے اطمینان سے گرنتھ صاحب کی چوکی کے سامنے بیٹھا پاٹھ سُن رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اندر آکر سیس جھکایا۔ پھر دونوں باہر آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ منگل سنگھ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! کل زندگی کے بیتے ہوئے دن بہت یاد آئے۔ رونا بھی بہت آیا۔ آج میرا دل بہت ہلکا ہے بھوک بھی محسوس ہو رہی ہے مگر پہلے ایک کام کرنا ہے آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا"۔

"جانا کہاں ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "دور نہیں جانا ہے۔ میں آپ کو دس پندرہ منٹ میں فارغ کر دونگا"۔ دونوں کوٹھی سے باہر آئے اور موٹر میں بیٹھ گئے۔ منگل سنگھ نے

ڈرائیور سے کہا "دوست سیشن جج صاحب کی کچہری تک جانا ہے"۔ سیشن جج صاحب ابھی ابھی کچہری پہنچے تھے۔ انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ سردار صاحب۔ آج آپ کے مقدمہ کی پیشی تو نہیں ہے پھر آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟" "جناب ایک ضروری کام ہے یہ بڑے ڈاکٹر صاحب ہیں جناب انہیں...؟" ڈاکٹر صاحب کچھ گھبرائے۔

"ہاں ڈاکٹر صاحب کو کون نہیں جانتا" جج صاحب بولے۔ "ڈاکٹر صاحب کو یہ تکلیف میں نے صرف اس لئے دی ہے جناب! کہ یہ اس بات کی تصدیق کریں کہ اس وقت میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔ میرا جسم اور دماغ دونوں درست ہیں۔ کیوں ڈاکٹر صاحب؟" منگل سنگھ نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ڈاکٹر نے کہا: ہاں میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ اس وقت سردار منگل سنگھ جی کے ہوش و حواس بالکل بجا ہیں"۔

"جج صاحب۔ اب میں عدالت کی اجازت سے ایک بیان دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ بیان میرے بیٹے دلیپ سنگھ کے قتل کے مقدمہ کے بارے میں ہے جو جناب والا کی عدالت میں چل رہا ہے" سیشن جج صاحب بیان لکھنے لگے۔ "جج صاحب۔ میں مقتول دلیپ سنگھ کا بدنصیب باپ منگل سنگھ ہوں۔ میں اس وقت عدالت کے سامنے جو بیان دے رہا ہوں وہ اپنے واہگورو کو حاضر ناظر جان کر دے رہا ہوں بلکہ اس ست گورو کے حکم سے ہی دے رہا ہوں۔ جناب یہ دلیپ سنگھ کی پاس بک ہے اس میں اس کا ایک لاکھ پندرہ ہزار روپیہ جمع ہے۔ کچھ روپیہ شاید لاکروں میں بھی پڑا ہوگا۔ اس سے صاف ظاہر ہے وہ سمگلر تھا۔ کالا دھندہ کرتا تھا۔ اس کی موت ٹھیک اسی جگہ اور ان ہی حالات میں ہوئی تھی جیسا کہ زیر حراست جمعدار اور اس کا بیٹا بیان کرتے ہیں۔ مجھے اسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اسی کالے دھندے کے سلسلہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گیا ہے۔ افسوس کہ یہ بولنے میں وقت لگا۔ میں دلیپ سنگھ کا والد ہوں۔ جج صاحب۔ اور پورے ہوش میں ہوں۔ آج میں دلیپ کے قتل کا بدلہ لینے کیلئے قانون کو ورغلانے کیلئے نہیں آیا

ہوں۔ ڈوگرہ جمعدار یا اُس کے بیٹے کے ساتھ دلیپ کا کوئی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ یہ سب بنائی ہوئی کہانی ہے بالکل جھوٹ۔ باپ بیٹا دونوں ملزمان بالکل بے قصور ہیں انہوں نے گولی چلا کر اپنے فرض کی ہی ادائیگی کی تھی۔ اس مقدمہ کی وجہ سے انہیں حق مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے اُن کے ازالہ کیلئے میں دس ہزار روپے کی یہ چیک اُس بے قصور جمعدار اور اُس کے بیٹے کو عدالت کے ذریعہ دے کر اپنے گناہ کا کفارہ کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے عدالت میری یہ عرضداشت ضرور منظور فرمائے گی"۔ اتنا کہہ کر سردار منگل سنگھ نے ایک چیک عدالت کی میز پر رکھ دیا۔ جج صاحب نے منگل سنگھ کی طرف بغور دیکھا اور اُس کا بیان اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "سردار صاحب! اس پر دستخط کر دیجئے۔" "ڈاکٹر صاحب آپ بھی"۔ دستخط ہو جانے پر جج صاحب نے کہا۔ سردار صاحب، میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے عدالت کے روبرو یہ بیان دیکر قانون کا وقار بڑھایا ہے۔ میں آپ کے اس حوصلہ اور انسانی ہمدردی کے جذبہ کیلئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں"۔ عدالت بھر میں اس بیان کا چرچا ہونے لگا وہاں سے بات شہر بھر میں پھیل گئی۔

منگل سنگھ عدالت سے گھر آیا۔ اکھنڈ پاٹھ ابھی ہو رہا تھا۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ گرنتھ صاحب کے سامنے جا بیٹھا اندر لگے ہیں کیرتا ڈال کر اداس کرنے لگا۔ آج اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو ٹپک رہے تھے:۔

لال ٹین

از
مدن موہن شرما

لال ٹینیں ہی لال ٹینیں!

حسین چہروں کی طرح چمکتی دمکتی نئی لال ٹینیں۔ پرانی ٹیڑھی میڑھی لال ٹینیں جنہیں زنگ نے چاٹ لیا ہے ساری دوکان لال ٹینوں سے بھری پڑی ہے۔ دوکان کے اندر

ایک چارپائی اور کچھ برتن پڑے ہیں۔ ایک کنستر اور کنستر پر رکھی ہوئی باقی لال ٹینوں سے جدا لگ بھگ پچاس برس پرانی ایک اور لال ٹین ہے۔ لوگ اسے مستری رام رکھے کی دوکان کہتے ہیں دراصل یہ رام رکھے کی دوکان بھی ہے اور اُس کی رہائش گاہ بھی۔ پرانی لال ٹینوں کی مرمت کرنے اُن کو نئی زندگی دینے اُسے ایک مدت ہو گئی ہے وہ لال ٹینوں کی ہر بیماری کی تشخیص اور اُن کا علاج کر سکتا ہے۔ کوئی بھی لال ٹین لے آیئے چاہے بتی اونچی نیچی کرنے والی اس کی کل بگڑ گئی ہو۔ یا نہیں ٹھیک طرح سے نہ چڑھتا ہو۔ یا اس کا شیشہ ٹھیک نہ بیٹھتا ہو۔ یا اُس میں دھواں بھر جاتا ہو۔ وہ جھٹ سے بجھ جاتی ہو۔ رام رکھا سب کچھ ٹھیک کر دیتا ہے۔ لال ٹین اچھی طرح سے روشنی دینے لگے گی۔ بتی کی لو کا نکھرا نکھرا ہو جائیگا اور تیل پوری سُرعت سے ٹپکنے لگے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ پرانی سے پرانی۔ بیمار سے بیمار لال ٹین بھی رام رکھے کے ہاتھوں نئی زندگی پاتی ہے۔ یہی رام رکھے کا کمال ہے۔ آج بجلی کا زمانہ ہے گھر گھر بجلی سے روشن ہے لیکن وہ دن بھی تھے جب گنتی کے گھروں میں ہی بجلی لگی تھی تب رام رکھے کو کون نہیں جانتا تھا آج بھی جن گھروں میں بجلی نہیں ہے اور جہاں لال ٹینوں سے ہی اُجالا ہوتا ہے اُن گھروں کے لوگ رام رکھے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ رام رکھا پرانی لال ٹینوں کی مرمت نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی دوکان پر نئی لال ٹینیں بھی بکتی ہیں اور نہ لوگ جو اس بجلی کے یگ میں بھی اپنی بیٹیوں کے جہیز میں لال ٹین دینا ضروری سمجھتے ہیں اُن کی نظر انتخاب بھی رام رکھے کی دوکان پر ہی پڑتی ہے۔ وہ ہے تو لال ٹینوں کا مستری لیکن کبھی کبھی وہ کسی فلسفی کی طرح بڑی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے جب کبھی وہ آئینہ میں اپنے برف کی مانند سفید بال دیکھتا ہے اور دیکھتا ہے اُس جھُرّیوں کے جال کو جو کسی ان جانے مچھیرے نے زندگی کی مچھلی پکڑنے کیلئے اُس کے چہرے پر ڈال رکھا ہے تو وہ یوں سوچنے لگتا ہے۔ "میں بھی تو ایک لال ٹین ہوں برسوں پرانی لال ٹین جس کے تمام کل پرزوں کو زنگ نے کھوکھلا کر دیا ہے ابھی کچھ تیل باقی ہے جیون کی جوت ابھی مدھم ٹمٹماتی روشنی دیتی جا رہی ہے نہ جانے کب یہ کانپتی تھرتھراتی بتی بجھ جائے کب زندگی

کے تیل کا آخری قطرہ ختم ہو جائے اور یہ مدھم مدھم روشنی موت کے گہرے اندھیرے کنوئیں میں گم ہو جائے۔۔۔" لال ٹینیں مرمت کرتے ہوئے جب کبھی وہ ایسے ہی خیالوں میں کھو جاتا ہے تو ایک کمزور مانند تدریسے کانپتے ہاتھوں کی لرزش بڑھ جاتی ہے۔ اس کا تمام جسم تھرتھرا اٹھتا ہے۔ اس کے ہاتھ کام سے رک جاتے ہیں اور وہ بحرِ غم میں غوطے کھانے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں یاس کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور ان غمگین آنکھوں سے وہ دکان کے اندر پڑی پرانی لال ٹینوں کے انبار کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ دکان کے دروازوں کے تختوں پر لٹکائی ہوئی نئی چمکتی لال ٹینوں پر اس کی نظر نہیں ٹھہرتی۔ اس کے ذہن پہ جیسے کسی نے شکنجے کس دیئے ہیں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور پھر وہ دکان کے باہر گلی میں سے گزرنے والوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ لوگ آ رہے ہیں۔ لوگ جا رہے ہیں رام رکھا کھوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہا ہے۔ "میری دادی کہتی ہے کہ میں بڑا سمجھدار ہوں"۔ "میری اماں جی کو پورا یقین ہے کہ بڑا ہو کر میں بہت بڑا آدمی بنوں گا"۔ "ارے بھاگو بھاگو وہ پتنگ کٹی"۔ چھوٹے چھوٹے انجان بچے۔ اپنی انجان دنیا کے خوابوں کے راجے! وہ ڈرتے بھاگتے۔ کھیلتے۔ کودتے۔ گاتے اور میٹھی مسکانیں بکھیرتے انجان چلبلے بچے!۔ رام رکھا انہیں دیکھ کر سوچتا ہے "نئی بنی۔ نیا تیل۔ بازارِ عالم میں رکھی ہوئی یہ نئی چمکتی مسکراتی۔ لال ٹینیں کسی چابک دستِ استادِ فن مستری کے ہاتھوں کا کمال ہے"

"سنو تو؟"۔ "کیا ہے؟"۔ "ایک بات بتاؤ؟"۔ "کیا؟"۔ "بھلا چاند سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟"۔ معصوم نظریں دھرتی پہ کچھ تلاش کرنے لگیں۔ پھولوں کی طرح نازک نازک ہونٹوں پر لطیف سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ بھاگ گئے۔ ایک لمبا بانکا جوان! سنبلے کی لاٹ کی طرح سرسراتی ایک لڑکی۔ اور رام رکھے کے دماغ میں خیالات کی ترنگیں اٹھتی ہیں

"پوری آب و تاب سے جلتی یہ لال ٹینیں۔ زندگی میں چاندنی بکھیرتی لال ٹینیں۔ نہ آندھی کا ڈر۔ نہ طوفان کا خدشہ۔ اندھیرا ان سے کوسوں دور۔ یہ جہاں بھی ہیں نور بکھیر رہی ہیں۔ دنیا کا وہ کون سا بدنصیب کونہ ہے جہاں ان کی روشنی نہیں ہے؟"۔ "کیا پتا جلے کہیں بات

بستی نظر نہیں آتی"۔ "کیسے اُترے یہ بوجھ؟ ایشور کرے کسی کے ہاں لڑکی پیدا نہ ہو"
"لڑکی والوں کے سر آسمان کو چھوتے ہیں"۔ ایک ادھیڑ عمر کا مرد اور اُس کی ہم عمر ایک عورت
دونوں کے چہرے پر مانو ابھی اندیشوں کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ اُن گھٹاؤں میں کبھی کبھی امید
کی روشنی بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ اور رام رکھا سوچ رہا ہے "یہ پرانی لال ٹینیں۔ بہت سا
تیل جل چکا ہے۔ تھوڑا باقی ہے۔ کل پڑے؟ کچھ گھس چکی ہیں۔ کچھ گھس رہی ہیں۔ کام
نبھائے جا رہی ہیں۔ کبھی آندھی کا کوئی ظالم جھونکا آئیگا تو یہ تھر تھر کانپ اُٹھے گی۔ جتنی
دیر تک سکون ہے سب ٹھیک ہے۔ دنیا کی کتنی ہی اندھیری کوٹھڑیاں ان کے دم سے روشن ہیں
مستری پل بھر کے لیئے دکان کے اندر رکھی ہوئی پرانی لٹکی ہوئی لال ٹینوں کی طرف ایک بار پھر
دیکھتا ہے پھر باہر نظر دوڑاتا ہے۔ سامنے ایک بوڑھا۔ ایک بڑھیا ایک دوسرے کو سہارا دیتے
ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ ڈگمگاتے قدم۔ تھرتھراتے جسم!!۔ "عمر بیت گئی ہے لجیا۔ اب
جینے میں کوئی مزہ نہیں رہا"۔ "پرمیشور سے یہی پرارتھنا ہے۔ کہ آپ کے ہاتھوں سے کنیا بیاہوں"
"یہ کچھ لال ٹینیں"۔ رام رکھا سوچ رہا ہے۔ "سب کچھ گھس چکا ہے کوئی پتہ نہیں تیل کب ختم
ہو جائے اور۔ اور یہ بتیاں بجھ جائیں"۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ "زندگی کا ایک آنند
دن وقت کے اندھیرے جنگل میں کھو گیا۔ اداسیوں کے بوجھ سے لدی ایک اور رات آ رہی ہے
سانجھ کے جھٹ پٹے میں رات کی سیاہی گھلتی جا رہی ہے"۔

جن لوگوں نے مرمت کیلئے لال ٹینیں دے رکھی تھیں وہ انہیں واپس لے گئے ہیں اب
رام رکھا کانپتی ٹانگیں سنبھالتا ہُوا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اُس نے کنستر پر پڑی ہوئی پرانی لال
ٹین اٹھائی اور اُسے اچھی طرح سے صاف کیا۔ یہ بھی رام رکھے کی طرح ہی پرانی دکھائی دیتی ہے
دکان میں اچھی نئی چمکیلی اور کتنی ہی لال ٹینیں ہیں مگر اُسے اِس لال ٹین سے خاص اُنس ہے
وہ لال ٹین جلا کر رام رکھا دکان کی دہلیز پر کھڑے ہو کر بار بار سامنے والی گلی کی طرف دیکھ
رہا ہے۔ گویا کسی کا منتظر ہے تھوڑی ہی دیر کے بعد اُسے سامنے والی گلی میں سے گیارہ۔ بارہ برس

کی ایک لڑکی دکھائی دیتی ہے۔ رام رکھے کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھتا ہے "مستری جی۔ دادی نے کہا ہے اس لال ٹین کو ٹھیک کر دو۔ بہر حال ٹھیک کر دو اگر سے جاتی ہے بھی پتہ نہیں روز روز ایسے کون سی گولی لگ جاتی ہے؟" لڑکی ایک بہت ہی پرانی لال ٹین رام رکھے کے ہاتھوں میں تھما دیتی ہے۔ رام رکھا اسے کانپتے ہاتھوں سے تھام لیتا ہے اس کے چہرے پر اداسی چھا رہی ہے یا مسکراہٹ کھل رہی ہے؟۔ اندر جلتی پرانی لال ٹین کی مدھم روشنی میں اس بات کا ٹھیک پتہ نہیں چل سکتا۔ رام رکھا اس لال ٹین کو دکان کے اندر لے جاتا ہے پتھر پر رکھی ہوئی جلتی لال ٹین اور یہ لال ٹین دونوں ایسی دکھائی دیتی ہیں گویا جڑواں بہنیں ہوں۔ مستری کافی دیر تک دونوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر کسی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ لڑکی کی آواز پھر سنائی دیتی ہے "مستری جی جلدی کرو مجھے دیر ہو رہی ہے" مستری کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے وہ سنبھلنے کی کوشش کرتا ہے پھر بڑی احتیاط کے ساتھ لال ٹین کا شیشہ اتارتا ہے۔ بتی جلانے والی کل کو ٹھیک کرتا ہے۔ کہیں سے دھول اور میل دور کرتا ہے اور پھر لال ٹین واپس کرتا ہوا پوچھتا ہے "لڑکی تیری دادی تو اچھی ہے نا؟" ۔ "اچھی بھلی تو ہے" لڑکی جھنجھلا کر جواب دیتی ہے۔ "تیری اماں اس کی خدمت تو کرتی ہی ہوگی؟" ۔ "کیا خدمت کرنی ہے مستری جی۔ دادی تو بھلی چنگی ہے دن بھر چارپائی پر پڑی حکم چلاتی ہے۔ ہمارا تو ناک میں دم آگیا ہے اماں کہتی ہے..."

پوری بات سننے سے پہلے ہی رام رکھے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں چہرے پر ایک آدھ جھری اور ابھر آتی ہے اور گہری ہو جاتی ہے اور پھر نہ جانے کس سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔

"میری اماں کہتی ہے کہیں یہ پکی ہوئی "کھوسٹ" چلے تو ہمارا بھی چھٹکارا ہو۔ اس سے ... اور آپ کو معلوم ہے مستری جی۔ میں کیا سوچتی ہوں؟" رام رکھا درد سے بے تاب نظروں سے دکان کی دھندلی چھت پر نہ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ "میں چاہتی ہوں" لڑکی بولتی چلی جا رہی تھی۔ "کہ کہیں دادی مرے تو ہمارے گھر میں نئی لال ٹین تو آئے۔ کتنی ہی بار اماں نے نئی لال ٹین خریدنے کا ارادہ کیا لیکن پتہ نہیں دادی کو اس پرانی لال ٹین سے کیا

پیارے کی وہی ہٹ ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں اس گھر میں ایسی لالٹین
سے اُجالا ہوگا۔" بڑکی چلی جاتی ہے لیکن رام رکھا بُت کی طرح دہلیز پر کھڑے کا کھڑا رہ
جاتا ہے۔ "یہ قیمتی لالٹین"۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا ہے اور آنکھوں سے
دو موٹے موٹے قطرے آنسوؤں کے نکل آتے ہیں۔ صبح ہو گئی ہے ہر طرف دھوپ ہی دھوپ
چھائی ہوئی ہے رام رکھے نے اندر سے دکان کی کنڈی کھولی۔ آج چارپائی پر سے
اٹھنے کو اس کا جی نہیں چاہتا۔ اس کا سارا بدن ٹوٹ رہا ہے۔ شاید اسے بخار ہو گیا ہے
لیکن پھر بھی وہ حسب معمول دریا پر نہانے چلا جاتا ہے۔ ڈھکی چڑھتے اُترتے وہ اس قدر
چُور ہو گیا کہ دکان تک پہنچنا اُس کے لیے محال ہو گیا۔ اتنی تھکان اس نے پہلے کبھی محسوس
نہ کی تھی وہ چارپائی پر گر پڑا۔ اس کا ہر عضو بالکل اینٹھ رہا تھا۔

"شاید بتی نیچے سرک رہی ہے یا تیل ہی ختم ہو رہا ہے کون اس بتی کو اُکسائے۔ کون
نیا تیل ڈالے؟" رام رکھا سوچ رہا تھا اور اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا
ہوتا جا رہا ہے۔ دوپہر کے وقت پڑوس کی ایک بڑھیا پکارتی ہے "رام رکھے! ارے
رام رکھے!! ذرا اُٹھ کر تھوڑی سی تکلیف کرنا تمہاری مہربانی ہوگی۔ میرے ساتھ تھوڑی دور
تک چلنا۔ بہو کے بچہ ہونے والا ہے اور گھر میں کوئی نہیں ہے"۔ رام رکھا بڑی مشکل سے
اٹھتا ہے اور اس بڑھیا کے ہمراہ ڈاکٹرنی کو بلانے چلا جاتا ہے اور واپس آکر پھر چارپائی
پر گر پڑتا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دکھائی دیتی ہے وہ رضائی اوڑھ لیتا ہے
تھوڑی دیر کے بعد وہی بڑھیا دکان کے باہر سے گزرتی ہے "رام رکھے! ہمارے
ہاں پوتا ہوا ہے۔ میرا پوتا۔ اب میں دادی بن گئی ہوں رام رکھے!!" یہ الفاظ
رام رکھے کے کانوں میں پڑے۔ اُس کے دل کی کلی پھول کی طرح کھل اُٹھی پھیکی مسکراہٹ
شوخ ہو کر اُس کے ہونٹوں پر کھل اُٹھتی ہے۔ "مبارک! بہت بہت مبارک!!"
"نئی روشنی۔ نیا تیل۔ نئی بتی۔ نئی لالٹین..."۔ اُس کے منہ سے نکل رہا ہے۔

لیکن اُس کا جسم بخار سے جل رہا ہے۔ اُس کی سانس گھُٹ رہی ہے۔ آنکھیں بوجھل ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ بتی نیچے ہی نیچے ڈھلتی سمٹتی جا رہی ہے۔ روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ اندھیرا گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے بشام کے۔ تب وہی لال ٹین والی لڑکی پھر آئی۔ مگر اب اُس کے ہاتھ میں وہ پرانی لال ٹین نہیں ہے آج اسمتے ساتھ اُس کی ماں بھی ہے لڑکی کتنی ہی دیر تک دوکان کے کواڑ کھٹکھٹا کر مستری کو آواز دیتی رہی ہے آخر تنگ آکر ماں سے کہتی ہے "ماں! مستری جی دوکان میں نہیں ہیں۔ چلو کسی دوسری دوکان سے ہی خرید لائیں نئی لال ٹین"۔

کاسنتو کا کالا پتھر

از
کھجوریہ
ترجمہ: نریندر

کاسنتو ایک ایک پگ اٹھتی ہانپتی جا رہی ہے۔ "گُر۔ گُر۔ گُر..." یہ آواز سن کر کوڈو بتنیز اپنی تھوتھنی اُٹھا کر اوپر دیکھتا اور پھر اپنی گردن ہلانے لگتا۔ اُس کے گلے میں پڑا ہوا چھوٹا سا گھنگھرو بج اُٹھتا۔ اور کوڈو کاسنتو کی طرف بھاگتا۔ گھنگھرو کی مدھم سی آواز سن کر کاسنتو کو اپنے سامنے دو نازک ننھے ننھے ہاتھ دکھائی دینے لگتے۔ جن میں کبھی چاندی کا ایک ایک کنگنوں پڑا ہوا تھا۔ کوڈو کے گلے میں ان ہی کنگنوؤں کی ایک گھنگری (چھوٹا گھنگرو) پڑی ہوئی تھی۔ کاسنتو کی دنیا گول نہیں لمبی ہے جس پر موڑ ہی موڑ دکھائی دیتے ہیں اور ہر موڑ پر کاسنتو نے نئی زندگی دیکھی ہے۔ گہری گھاٹی پار کر کے جب کاسنتو چھپڑ والی پیچ پر پہنچی تو سامنے اُسے بانسری پر لہراتی رنگ برنگی جھنڈیاں دکھائی دینے لگیں۔ اُسی طرف وہ چل پڑی اور جب وہ جگتو برشالے کے "تھان" پر پہنچی تو وہ جھنڈیاں سیاہ دکھائی دینے لگیں تھان کے اندر جگتو برشالا دیوتا کے سامنے دھوپ جلا رہا تھا۔ گوگل دھوپ کی خوشبو تھان

ا۔ چھوٹے چھوٹے کنگن

کے اندر اور باہر تھڑے (چبوترے) تک پھیل رہی تھی۔ دھوپ والی کڑچھی ہاتھ میں لئے
بردالا باہر آیا۔ "جے۔ جے مہر گل دیوتا۔ تیری سام جے۔ جے"۔ "یہ کون ڈولی ہے؟"
"بردالاجی! میں حاضر ہوں"۔ بردالا دھوپ والی کڑچھی چاروں طرف گھمانے لگا "مجھے دِشا میں
ہمری رکھیا کرو۔۔۔ مہر گل مہاراج"۔ سنکھ پورنے کے بعد بردالا لمبی چلم لیکر ایک ستون کے سہارے
برآمدے کے کونے پر بیٹھ گیا۔ بک۔ بک۔ بک، پہلے ہلکے ہلکے کش لینے کے بعد اُس نے زور سے دم
کھینچا۔ چلم پر ایک لاٹ ناچ اُٹھی۔ لاٹ کی روشنی میں اُسے کاستو کی ایک جھلک سی دکھائی دی
"کون ذات ہے تیری؟"۔ "مہاشی"۔ "اس بھلے (بستی) میں کس سے رشتہ ناطہ ہے؟"۔
"بردالاجی ہاں سُسر کے سائیں (خاوند) کے چلے جانے کے بعد سب رشتے ناطے ٹوٹ گئے ہیں
میرے مہاشئے کو پھانسی لگے ایک سال بیت چکا ہے"۔ "نہ کیوں؟" اُس کی طبیعت ذرا
تیز تھی۔ اُس نے اپنے دو شریکوں (بھائی بنادوں) کو ایک ساتھ مار ڈالا تھا"۔ ایک آہ بھرتے
ہوئے کاستو نے کہا: "ماتھا پھوٹے اُس تقدیر کا۔ اس نے ایک کھلتی پھولتی گرہستی اجاڑ دی
گھر بار بک گیا۔ میں نے ڈیڑھ ڈیڑھ من پرولا (سفید مٹی) سر پر ڈھو کر قصبے میں فروخت کیا
بڑے بڑے نامی۔ بڑے لائے وکیل کئے۔ بڑی سے بڑی عدالت میں اپیل کی۔ لیکن میرے مہاشئے کی
قسمت میں شائد پھانسی لگنا ہی لکھا تھا"۔ "اچھا۔ تو تو پھانسی کی عورت ہے؟۔ ایک دن
وہ اس طاق پر سوالی بن کر آیا تھا۔۔۔ اولاد کیلئے۔ لیکن تو۔ اب۔۔؟"۔
— "سنیئے بردالاجی۔ پردیس جا کر بھیک مانگنے میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں۔ لیکن اپنے
شریکوں میں۔ اور پھر شریک بھی وہ جنہوں نے ہمارے خلاف بڑھ چڑھ کر گواہیاں دی ہوں۔
مہاشئے کے پھانسی چڑھتے پر اُن لوگوں نے خوشیاں منائی تھیں اب میں وہاں کیوں کر دن
کاٹ سکتی ہوں؟"۔ "گھبراؤ نہیں مہاشی۔ تیری قسمت کا ستارہ ابھی غروب نہیں ہوا ہے۔
سُر گل دیوتا نے تجھے اپنی شرن میں بلا لیا ہے"۔ کاستو نے ایک انڈ اُپلا پلٹ کر رکھا
دیمک کُل بُلا پڑی۔ کر۔ کر۔ کر۔۔۔ بعد کو وہ "بک مک" کرتا چن چن کر دیمک کھانے لگا

کاستو کے جسم پر بھی وقت نے کئی اُپلے تھاپ رکھے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پھنسیاں۔ بڑے بڑے "پھوکلے" اُن میں سے کچھ خشک ہو کر بھربھرا چکے ہیں اور کچھ باہر سے خشک لیکن اندر سے ابھی گیلے ہیں۔ اور اُن کے اندر کیڑوں مکوڑوں کی کلبلاہٹ سے کاستو کے بدن میں اینٹھن سی ہونے لگتی ہے اور اس کی زبان بے ذائقہ پھیکی سی ہو جاتی ہے۔ اُس رات کو جب جگنو کی جان پڑی تو کاستو نے بھی کالکا کا روپ دھارن کر لیا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے جگنو کا بازو مروڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی لٹکتی لٹیں (زلفیں) نوچتی ہوئی وہ پوچھ رہی تھی "ارے بدوالے۔ کیا سمجھ کر تو نے مجھ پر ہاتھ ڈالا ہے؟ میرے مہاشے نے ایک ساتھ نو خون کئے تھے تو ایک خون کرنے کی طاقت تو میرے اندر بھی ہے۔ بول پاپی۔ پاکھنڈی۔۔؟"

جگنو نے کاستو کو "ماں" کہہ کر پکارا اور منت خوشامد کر کے اُس سے اپنی جان بخشوائی تھی۔ کاستو اسی رات کو وہاں سے چلی گئی۔ بدوالے کو اُس نے معاف کر دیا لیکن غصہ سے اُس کا جسم کانپ رہا تھا۔ الغوزوں پر کوئی "جنی" کی دھن بجا رہا تھا۔ ساون مہینے کی سیاہ کالی رات تھی۔ کاستو کا ڈراؤنا روپ دیکھ کر بستی کے کتے بھونکنے لگے۔ "اندھیرے میں کیسے دیکھ کر یہ کتے بھونک رہے ہیں؟" شونکو چوکیدار کی آواز سنائی دی۔ "جی پتہ نہیں بستی کے یہ کتے میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟۔" "تو ہے کون؟" "میں پردیسن ہوں"۔

شونکو چوکیدار نے پاس آ کر دیا سلائی جلائی۔ "بستی میں کس کے ہاں جانا ہے تجھے؟" "جس کے ہاں ٹھکانہ مل سکے۔ محنت مزدوری کر کے جہاں روٹی کا ٹکڑا مل سکے"۔ شونکو نے جیب سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور پھر دیا سلائی جلا کر کاستو کی طرف دیکھا۔ "کیا ذات ہے تیری؟" "مہاشنی"۔ "لیکن یہاں الغوزے کون بجا رہا تھا؟" "کیوں؟" "کچھ نہیں۔ مجھے تسکین ہوئی تھی کہ چلو کوئی نہ کوئی تو جاگ رہا ہے"۔ شونکو نے ایک لمبا کش کھینچا۔ کاستو کو شونکو کے گلے میں پڑی ہوئی الغوزوں کی جوڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ میرا مہاشہ بھی اسی طرح الغوزے بجایا کرتا تھا۔ کاستو شونکو کے گھر آ بسی۔ چوکیدار کے گھر پر اس کی

ماچنی

بوڑھی ماں ہی تھی۔ کاستو نے اپنے کام کاج سے ماں بیٹے کو موہ لیا۔ بستی میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ "شونکو چوکیدار کوئی پہاڑی رکھیل لے آیا ہے"۔ جگتو برداُلے کو بھی [illegible] پڑی "بستی پر بھاری مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ گوڑ بنگالے کی ایک جادوگرنی نے بستی پر اپنا خونی پنجہ جما لیا ہے ....."۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں چل نکلیں۔ کوئی کہتا "وہ مسان سے اپنا کام دھندہ کرواتی ہے۔ مسان راتوں رات شونکو کے کھیتوں میں نلائی۔ گڈائی کر دیتا ہے۔ وہ ایک گھنٹے میں اتنا گھاس اٹھا لاتی ہے جس کو مویشی تین دن کھا کر بھی ختم نہیں کر سکتے ..."۔ یہ سب سن کر شونکو کی ماں کہتی "بیٹا۔ لوگ سچ کہہ رہے ہیں۔ بردالا کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ سچ ہی یہ عورت کوئی چھلاوہ ہے۔ بھاڑ میں جائے اس کا کام۔ بیٹا تم اسے گھر سے نکال دو"۔ شونکو یہ سب سن کر مسکرا دیتا یا اکیلے میں الغوزہ بجانے لگتا۔

بڑھیا بار بار اُٹھ کر گل کے تھان پر جاتی اور اپنے سر پر دو ہتڑ مار کر کہتی "بردالا جی۔ میرے بیٹے کو بچا لو۔ اس ڈائن نے اسے بھیڑو بنا رکھا ہے"۔

جگتو زمین پر دو ہتڑ مار کر کہتا "بھاری آفت نازل ہونے والی ہے۔ دیوتا ناراض ہو گیا ہے ہر رات کو وہ مجھے جھنجھوڑتا ہے مگر میں کیسے جگاؤں۔ ساری کی ساری بستی سو رہی ہے پھر لوگ جاگیں گے لیکن اس وقت جب یہ گوڑ بنگالے کی جادوگرنی سب کو نگل جائیگی"۔

کاستو۔ آپ اُلٹی پلٹتی چلی جا رہی ہے۔ "گر۔ گر۔ گر"۔ پہاڑوں کی برفانی پرتیں آج پھر پگھل رہی ہیں اور گزری بیتی باتیں لاشوں کی طرح اس برف میں گویا دبی پڑی ہیں۔ برف میں دبی لاشیں۔ گویا ابھی ابھی ان کا دم نکلا ہو۔ ایک ایک لاش کاستو کے سامنے کھڑی ہو رہی تھی بستی کی وہ پنچایت ..... شونکو چوکیدار کی بوڑھی ماں کی چیخ و پکار۔ وہ پنچوں کے سامنے چھاتی پیٹ پیٹ کر کہہ رہی تھی۔ "پنچو! یہ گوڑ بنگالن میرے بیٹے کا کلیجہ چاٹ گئی ہے میرے لخت جگر کا لہو ابھی اس کے ہونٹوں پر چمک رہا ہے۔ پنچ پرمیشر۔ میرا انصاف کرو"

جگتو بردالا ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر کہہ رہا تھا "پنچو۔ یہ عورت نہیں جادوگرنی ہے۔ کرکسا ہے۔ ڈاکنی ہے جس نے اپنے دو خصموں کے کلیجے کھا لئے ہیں"۔ اور دوسری طرف چھوٹا سا بچہ گود میں لئے کاستو بیٹھی تھی۔ وہ نہ بے ہوش تھی نہ باہوش۔ اس کی آنکھوں سے

آنسو بہتے بہتے خشک ہو گئے تھے اور اب آنسوؤں کے سرچشموں میں کچھ ہی کچھ باقی رہ گئی تھی۔ لیکن کاستو اس دلدل میں بھی چلی جا رہی تھی گویا چلنا ہی اس کا ایمان ہے پنچوں کا فیصلہ سر ماتھے پر۔ کاستو بستی سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے مردوں نے سرسوں پھینکی۔ عورتوں نے مٹھیاں بھر بھر کر راکھ اڑائی کہ یہ جادوگرنی پھر بستی میں واپس نہ آ جائے۔ کاستو نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ وہ اپنی تیرہ سالہ مسافت کا ایک اندر موڑ کاٹ چکی تھی۔ اس کے آگے ہموار راستہ تھا۔ نچلی طرف ایک نالہ بہتا تھا اور اس کے پار ایک گپھا ہی بنی تھی جہاں سردیوں میں بکروال مقام کیا کرتے تھے۔ اسی گپھا میں کاستو اپنے بچے اور تیتر کو لے کر جا بسی۔

تیتر دھول مٹی میں لوٹ رہا تھا۔ کاستو غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی وہ دل میں کہنے لگی۔ "بیٹا! میں بھی تو پرندہ ہی تھی۔ نہ معلوم کس غلطی سے بدھاتا نے مجھے انسانی قالب میں ڈال دیا ہے۔ لیکن قسمت کا پھیر دیکھو کہ انسان نے مجھے اپنی برادری سے ہی خارج کر دیا ہے نہ مجھے چلنے ہی دیا نہ اڑنے ہی دیا۔" اسی وقت چرواہے ریوڑ کے ٹولیوں کو واپس گھر لاتے ہوئے دوسری طرف سے چلا اٹھے۔ "کانسو۔ کانسو۔ کال سو۔ وہ دو دوا"

کاستو بھی گویا ان کی انتظار میں کا بیٹھی تھی وہ ان لڑکوں سے بھی زیادہ بلند آواز میں پکار اٹھی۔ "ہاں۔ یہ کوئی تیتر نہیں بلکہ کانسو ہی ہے۔ کانسو تمہاری ماں کا خصم"

یہ سن کر بچے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ بستی کے پیر و جوان آج بھی سرمگل دیوتا کی قسم کھا کر کہتے ہیں۔ "کانسو کا کلیجہ بھی کاستو نے ہی نکالا تھا۔" اور جگنو پروانا بھی دھول اور تھالی کے تال پر گردن ہلا ہلا کر اور کن چھانا[۱] کرتا ہوا کہتا ہوتا ہے۔ "کانسو کی طرح کاستو کے کانے تیتر کے اندر ہی قید ہے۔ یہ کوئی معمولی عورت نہیں گوڑ بنگالے کی۔۔۔۔" یہ باتیں گویا ہوا کے جھونکوں پر سوار ہو کر کاستو کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ وہ جگنو پروانے کا نام لے لے کر زمین پر تھوکتی اور اپنے بال اس طرح نوچتی تھی جیسے آج بھی جگنو کی بانوریاں نوچ رہی ہو۔ "اے بڑھاپے! اگو گل دھوپ کی خوشبو میں چھپا ہوا تیرا اصلی روپ میں پہچانتی ہوں۔ تیرا منحوس نفس اوہاں کے پیچھے

[۱] کن چھانا۔ کالے جادو کا دھندا۔ جادوں کے ذریعے کر ماضی اور مستقبل کا حال بتانا۔

چلنے۔ پلنے والے گندے کیڑوں سے بھی زیادہ غلیظ ہے۔ اے پاپی! تیرا گناہوں سے آلودہ جسم لوہے کے جھنڈوں کی مار سے اور زیادہ گنہگار اور بے شرم ہوگیا ہے۔۔"

کاستو اپنے خاوند کو اپنے سر(۱) کا سائیں ہی نہیں بلکہ گھر کا چراغ بھی سمجھتی تھی گھر تو اب اُجڑ چکا تھا لیکن "چراغ" کی تو اُس کُٹیا میں بھی ضرورت تھی۔ اور کاستو کا یہ آخری چراغ تھا کانسو جس کا نہ گھر تھا نہ گھاٹ۔ وہ قصبے کی کچہریوں میں جھوٹی گواہی دیتا اور بستی سے ناجائز شراب لے جا کر قصبہ میں فروخت کیا کرتا تھا وہ خود بھی پکا شرابی تھا۔ ایک روز شام کو وہ زیادہ پی کر نالے کے پار گر پڑا۔ گرنا اُس کے لئے کوئی اَن ہونی بات نہیں تھی کیونکہ اپنی زندگی میں وہ چلا کم اور گرا زیادہ تھا۔

اگلی صبح کاستو نے وہاں جا کر دیکھا کہ وہ اُسی طرح بے ہوش پڑا ہے۔ کاستو گھبرا گئی۔ "ماتھا پھوٹے اِس قسمت کا۔ اب ایک اور کلیجہ اُس کے ذمہ چڑھنے لگا تھا" وہ اُس کے قریب گئی۔ کانسو کی سانس ابھی چل رہی تھی۔ وہ اُسے اُٹھا کر لے آئی اور دس دن تک اُس کی ٹہل سیوا کرتی رہی۔ بچے کو پیٹھ پر لادے وہ قصبہ میں جا کر پردلا۔ جھاڑو اور چھکریاں بیچتی اور اُن پیسوں سے کانسو کے لئے دوائی خرید لاتی۔ کانسو اچھا ہو گیا تو ایک دن اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کہنے لگا۔ کاستو ہونی! اس بار تو تُو نے مجھے بچا لیا ہے لیکن آخر ایک دن مجھے کہیں نالے میں ہی گر کر مرنا ہے"۔

کاستو جواب دیتی۔ "اگر میں بچانے والی ہوتی تو اپنے دو خصموں کو بچا لیتی؟ نہیں میں بچانے والی نہیں۔ کھانے والی ہوں۔ بستی کا بچہ بچہ مجھے گوڑ منگالن کہتا ہے۔"

کانسو نے جواب دیا۔ "پہلے تو تُو نہیں تھی لیکن اب اِس اجاڑ بیابان جگہ میں رہ کر ضرور ہی گوڑ منگالن ہو جائیگی۔ اری موئی۔ آدمی کو آدمی کا سہارا ہوتا ہے"۔

کاستو ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہتی۔ "کانسو! بدھاتا نے میری مانگ میں سندھور نہیں۔ اُدھیلوں کی راکھ بھرنی لکھی ہے۔ اس لئے میں جدھر بھی جاتی ہوں مجھ پر راکھ ہی پڑتی ہے"۔ کانسو اپنی چھاتی ٹھونک کر کہتا۔ کاستو میری! اگر یہ بات ہے تو کانسو بدھاتا کے لکھے کو مٹا کر تیری مانگ میں سندھور ہی بھرے گا"۔

(۱) مالک۔ خاوند

ماہنوں کی بستی میں ایک بار پھر بھونچال سا آگیا۔ عورتوں میں چرچے ہو رہے تھے
"یہ مرد نکھٹو بھی ۔ ۔ ۔ ۔ اِن کا سینہ جلے۔ کیسے گندے گندے ہوتے ہیں۔ دیکھو نا
وہ گوڑ بنگالے کی ناری منش پُش کر کے اِن کے کلیجے کھانے جا رہی ہے اور یہ مرد بھی
بھی اُسی کی طرف کھنچتے جا رہے ہیں گویا وہی ناری اس دنیا میں حسن کی دیوی رہ گئی ہے"
اور مردوں کی ٹولی کہہ رہی تھی۔ "یہ بنگالی مہاشی ڈائن ہی نہیں۔ اِس کے پاس کوئی "ٹونے کا
منتر" بھی ہے۔ ایک کے بعد دوسرا پروانہ اس پر جان دینے کو آجاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

اُدھر ٹکنتو بُڑا اپنے جسم کو تھرا تھرا کر اور چھاتی بجا کر پیشن گوئی کر رہا تھا "یہ
گرکسا ڈائنی ایک دن کانسٹو کا کلیجہ بھی نکال کر کھا جائے گی۔ اگر ایسا نہ ہوا تو سرگل دیوتا
کا یہ چیلا بھیرا میں ڈھونڈنے والی تیلی سے اپنی یہ لٹیں (بالوں والی) کتروا دے گا۔ ہے سرگل
دیوتا، تیری شام ۔ ۔ ۔ ۔" کانسٹو یہ سب باتیں سُن کر آنکھیں بند کر لیتا اور زور کا
قہقہہ لگا کر کہتا۔ "کانسٹو تو بالکل فکر نہ کر پھر بھیجے کلیجے کی شراب پہلے ہی چاٹ چکی ہے"۔

سورج کی سنہری ٹکی غوطہ لگانے کی تیاری میں تھی۔ کانسٹو کے جسم کا ہر عضو آج
ٹوٹ رہا تھا۔ سوکھے ہوئے اُپلے اس نے ایک طرف کر دیئے تو کوّے نے اُس جگہ سے دیمک
کا شکار کیا اور پھر پھر سے کر آڑو کی ایک شاخ پر بیٹھ کر چونچ سے اپنے پر کھجلانے لگا تو
اُس کے گلے میں پڑا ہوا دو چھوٹا سا گھنگھرو بجنے لگا۔ یہ آواز سُن کر کانسٹو کے سامنے اُس
کی بچی کے دو چھوٹے چھوٹے نازک ہاتھ آگئے جن میں کنگنوں پڑے ہوئے تھے یہ کنگنوں
آخری بار تب چھنکے تھے۔ جب کہ کانسٹو نے بچہ کے بخار سے تپتے ہوئے ہاتھوں سے انہیں
اُتارا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اُن چھوٹے چھوٹے کنگنوں کو گھور گھور کر دیکھتی رہی اور پھر
اُن میں سے ایک گھنگھرو اُتار کر وہ کنگن اُس نے کانسٹو کو دیئے اور ایک آہ بھر کر بولی تھی
"یہ کنگن میرے چچا کیدار نے بڑے چاؤ سے بنوا دیئے تھے"۔ چچا کیدار کا نام سن کر کانسٹو تنک
کر بولا۔ "اگر میرا بچہ بچ گیا تو میں اُسے سونے کے کنگنوں بنوا دوں گا۔ اری میں بھی عدالتوں
کا سفر رہا ہوں جس کے خلاف گواہی دے دوں ۔ ۔ ۔ ۔"۔ کانسٹو ڈاکٹر کو بلانے کیلئے شہر
چلا گیا۔ کانسٹو اپنے کمزور، لاغر بچے کو گود میں لے کر اُسی کی طرف ممتا بھری نظروں سے

دیکھ رہی تھی بچے کو سنیپات ہو گیا تھا اور وہ بچارا اس طرح اس طرح کراہ رہا تھا۔ گویا کوئی جنگلی بلی لول رہی ہو۔ دن چڑھ آیا۔ کاشتو ڈاکٹر کرنے کو نہ پہنچا اور کاشتو کا اکلوتا بیٹا ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ کاشتو کی راہ دیکھتے دیکھتے آخر بچارہ دوپہر کاشتو نے نالے کے پار جا کر ایک گڑھا کھودا اور بچے کو اچھی طرح نہلا دھلا کر اس گڑھے میں لٹا دیا۔

وہ ولاپ کر رہی تھی۔ "بچو! میں اپنی داول سکے ڈر سے زور زور سے رو بھی نہیں سکتی کیونکہ سن کر وہ کہیں گے کہ میں نے اپنے بیٹے کا کفن کیوں لیا ہے۔ بیٹا! میں تیرا علاج بھی نہ کروا سکی لیکن میں نے تیرے گناہ بخشوائے۔ میرے بیٹے۔۔۔"

تمام رات بھر کاشتو اپنے بچے کی قبر پر بیٹھی روتی رہی۔ لیکن کاشتو واپس نہ آیا۔ دوسرے دن سویرے "بیوتن" ٹھیکیدار نے بستی میں آکر اطلاع دی کہ کاشتو ڈھکی پر مرا پڑا ہے۔ بستی کے جب نمبرداروں کے دروازے اور کھڑکیاں کھول کر اٹھیں۔ رات کو سردی لگی، اس کے مطابق پڑھ سو گیا اور تھکاوٹ جھنجھنا اٹھی۔ جنگلوں کی بانسریاں بجا بجا کر چاند شور رہا تھا جیسے سیم کی شاخ ہو۔ اپنے چیلے کے لول سیکھ کر لیٹ گئے۔ ولی ان کی سلام۔

جیسے سردی لگی تھا شاید۔

کئی برسوں میں کاشتو ہر روز اپنے بچے کی قبر پر بریگیڈ کے سبزے پر آتی تاکہ اس کے لخت جگر کو دیکھ سکے۔ ایک دن وہ بریگیڈ کے نیچے بیٹھ رہی تھی کہ جھاڑی میں سے کالے تیتر کا ایک بچہ کڑکڑ کرتا ہوا نکل بھاگا۔ کاشتو نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کا گلو (چھوٹا بچہ) ہی تیتر بن کر دوبارہ آگیا ہے۔ وہ اپنے بچے کو گودو کہہ کر بلاتی تھی۔ اس لیے تیتر کو بھی وہ اسی نام سے بلانے لگی۔ اپنے بچے کے کنگن بہت اتار لئے، گھنگھرو اس نے گودو کے گلے میں ڈال دیا۔ ادھر جگنو نے بستی میں افواہ بھیلوتری کہ کاشتو نے تیتر کے اندر کاشتو کی روح قید کر رکھی ہے۔ کاشتو نے یہ شرارت بھری افواہ سنی تو تڑپ اٹھی۔ "دانتا بھڑوے اس پاپی پر والے گا۔ گودو تو میرا لخت جگر ہے۔ وہ لخت جگر جو بلا علاج بھاگ سکے ہی نالے کے پار آج بھی چپ چاپ لیٹا پڑا ہے۔ جس کی قبر پر میرا بریگیڈ سکے پتے بچھاتی ہوں۔ ۔۔۔"

۱۔ سنیپات: بخار کی بگڑی ہوئی حالت۔

کاتک مہینے کے سورج نے سونے آسمان پر لالی چھائی ہوئی تھی۔ کاستنو اپنے گھٹنوں پر ہاتھ
رکھ کر کھڑی ہوئی۔ کوڈو ابھی تک اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ کاستنو نے اس کے پاس آ کر کہا "آؤ
بیٹا کوڈو گھر چلیں"۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ کوڈو کچھ بدکا اور پھر پھڑ پھڑ...
کر کے اڑ گیا۔ کاستنو کو یوں لگا کہ اس کے اپنے پران پکھیرو ہی اڑے جا رہے ہیں۔ "کوڈو...
کوڈو... ارے او..." گرتی پڑتی لڑکھڑاتی کاستنو اسی طرف بھاگی جدھر کوڈو اڑا تھا۔ جھیل کے
والے بوہڑ کے درخت تک وہ اڑتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے بعد کاستنو کی آنکھوں میں اندھیرا
چھا گیا۔ "کوڈو بیٹا! تو نے اپنا دھرم نہیں نبھایا۔ تو بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا" اور وہ بلک بلک
کر رونے لگی۔ بستی سے باہر کوڈو، کوڈو پکارتی رہی لیکن ..." کاستنو کی کٹیا آج دوپہری کی طرح
سنسان تھی۔ کوڈو کا بانس کی تیلیوں کا خالی پنجرہ یوں دکھائی دے رہا تھا گویا کاستنو کی لاش
پڑی ہو۔ کاستنو آج پھر لہو لہان ہو گئی۔ اس کے سارے زخم آج پھر رسنے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ
"کوڈو بیٹے! بستی والوں کی جھوٹی باتوں کو۔ جگنو بردالے کی پاپ بھری باتوں کو۔ مجھے [illegible]
سب چھوڑ جانے والے تم لوگوں نے سچا کر دیا ہے"۔

جھونپڑی کے باہر زور کی آندھی چلنے لگی۔ کاستنو کو کوڈو کے گلے میں پڑے ہوئے گنڈے
کی ڈوری کا خیال آ گیا۔ "کہیں وہ ڈور کسی درخت کی ٹہنی سے الجھ گئی تو...؟" پھر اس کی
آنکھوں کے سامنے درخت کی ٹہنی سے لٹکتا ہوا کوڈو آ جاتا اور وہ گھبراہٹ میں باہر نکل کر
چلانے لگتی... "کڑ کڑ کڑ..." دو سال پہلے ایک بار کاستنو بیمار پڑی تو پانی پلانے
والا بھی کوئی نہ تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اسے جینے رہنے کی چاہ نہیں تھی
لیکن یہ فکر اس کی جان کو کھا رہی تھی کہ اس کے بعد کوڈو کا کیا بنے گا؟ اس کی دیکھ بھال
کون کریگا؟ کون اسے کھلائے پلائیگا؟ پھر جیسے کسی نے اس کے اندر سے پکار کر کہا کہ
وہ نہیں مر سکتی۔ وہ کوڈو کو بے سہارا چھوڑ کر نہیں جائیگی اور سچ مچ وہ صحت یاب ہو گئی۔
مگر آج کوڈو بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ کاستنو کو یوں معلوم ہونے لگا کہ آج اس کی
آخری رات ہے اب اس کی زندگی کا آخری موڑ آ گیا ہے۔ وہ زمین پر لیٹ گئی اس کے آنسوؤں
کے باندھ آج پھر ٹوٹ گئے۔ کاستنو ایک درد بھری آہ بھر کر سوچ رہی تھی۔ "ہاں میں نے

کیا سوچا تھا۔ ایک مہینہ پہلے اُسے پتہ چلا تھا کہ گھوروڑی گاؤں میں کسی آدمی نے مادہ تیتریاں پال رکھی ہیں۔ گوڈو کے لئے ایک تیتری حاصل کرنے کیلئے اُس نے کسی سے سفارش بھی کروائی تھی اندر بھرا اسے خیال آیا کہ اب گوڈو کیلئے ایک بڑے پنجرے کی ضرورت پڑ جائیگی۔ "نظر بد دور۔ اب گوڈو اپنی گرہستی بسائے گا۔۔۔" اور کاستنو اس طرح خوش ہونے لگی گویا سچ مچ ہی وہ کسی کی ساس بننے کی دادی بننے والی ہو۔ کاستنو نے آہستہ سے کروٹ بدلی۔ اُس کا جسم نڈھال اور بے سدھ ہو چکا تھا سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ لیکن ہر سانس کے ساتھ گوڈو۔ گوڈو کی مدھم سی آواز آ رہی تھی۔

اس حالت زار میں رات کا آخری پہر بیت گیا۔ اچانک کاستنو کے کانوں میں کوئی جانی پہچانی آواز آئی۔ وہ گہری بے ہوشی کی سمادھی سے نکل آئی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی گپھا کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کاستنو کو یوں محسوس ہوا کہ کوئی اُسے بلا رہا ہے وہ آہستہ آہستہ باہر نکلی۔ اخروٹ کے درخت پر گوڈو بیٹھا ہوا تھا۔ کاستنو دیکھ کر وہ ناچ اُٹھا اور اُس کے گلے میں پڑا ہوا گھنگھرو بج اُٹھا۔ چھن۔ ٹن۔ چھن۔ ٹن۔

کاستنو کی آنکھوں سے ممتا بھرے دو آنسو ٹپک پڑے اور اُس کے منہ سے نکلا:

گوڈو بیٹے۔۔۔!

سوگ سیڑھی

از
مدن سنگھ ٹھاکر

اسی دن کے لئے ہی دادی اماں اپنے بڑھاپے کا بوجھ سنبھالے زندہ تھی۔ آج تک وہ جہنم کی سی کوفت برداشت کرتی آئی تھی۔ اتنی لمبی عمر کے رنج و الم سہتی چلی آ رہی تھی۔ اُسکے ارمان بلکتے تھے کہ اس زندگی میں سکھ چین نصیب نہیں ہوا تو کم از کم دوسری دنیا میں تو ملے۔ دھرم گرنتھوں سے اُسے یہ تشفی ملی تھی۔ کہ پڑپوتہ سوگ سیڑھی تھام سکتا ہے جو اُسے سیدھا

کاتک مہینے کے سورج نے سونے آسمان پر لالی چھائی ہوئی تھی۔ کاستو اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے گم سم کھڑی ہوئی۔ کوڈو ابھی تک اپنے پر پھڑپھڑا رہا تھا۔ کاستو نے اُس کے پاس آ کر کہا "آ بیٹا کوڈو گھر چلیں"۔ اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا ہی تھا کہ کوڈو کچھ بہکا اور پھر پھر ر ر... کر کے اُڑ گیا۔ کاستو کو یوں لگا کہ اُس کے اپنے پران پکھیرو ہی اُڑے جا رہے ہیں۔ "کوڈو... کوڈو... ادھر آ..." وہ گرتی پڑتی گھبراتی کاستو اُسی طرف بھاگی جدھر کوڈو اُڑا تھا۔ سامنے والے بوہڑ کے درخت تک وہ اُڑتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے بعد کاستو کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ "کوڈو بیٹا! تو نے اپنا دھرم نہیں نبھایا۔ تو بھی مجھے چھوڑ کر چلا گیا"۔ اور وہ پاگلوں سا بلک بلک کر رونے لگی۔ بستی کے باہر کوڈو، کوڈو پکارتی رہی لیکن... "کاستو کی کوٹھری آج ویرانی کی طرح سنسان تھی۔ کوڈو کا بانس کی تیلیوں کا خالی پنجرہ یوں دکھائی دے رہا تھا گویا کاستو کی لاش پڑی ہو۔ کاستو آج پھر لہو لہان ہو گئی۔ اُس کے سارے زخم آج پھر رسنے لگے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ "کوڈو بیٹے! بستی والوں کی جھوٹی باتوں کو۔ جگنتو بروالے کی پاپ بھری باتوں کو۔ مجھے پاگل پاگل سے چھوڑ جانے والے تم لوگوں نے سچا کر دیا ہے"۔

کٹیا کے باہر زور کی آندھی چلنے لگی۔ کاستو کو کوڈو کے گلے میں پڑے ہوئے لال دھاگے کی ڈوری کا خیال آ گیا۔ "کہیں وہ ڈور کسی درخت کی ٹہنی سے الجھ گئی تو...؟" پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے درخت کی ٹہنی سے لٹکتا ہوا کوڈو آ جاتا اور وہ گھبراہٹ میں باہر نکل کر چلانے لگتی۔ "کُر۔ کُر۔ کُر۔..." دو سال پہلے ایک بار کاستو بیمار پڑی تو پانی پلانے والا بھی کوئی نہ تھا۔ اُس نے سمجھ لیا کہ اب آخری وقت آ پہنچا ہے۔ اُسے جینے رہنے کی چاہ نہیں تھی لیکن یہ فکر اُس کی جان کو کھا رہی تھی کہ اُس کے بعد کوڈو کا کیا بنے گا؟ اُس کی دیکھ بھال کون کریگا؟ کون اُسے کھلائے پلائیگا؟ پھر جیسے کسی نے اُس کے اندر سے پکار کر کہا کہ وہ نہیں مرے گی۔ وہ کوڈو کو بے سہارا چھوڑ کر نہیں جائیگی اور سچ مچ وہ صحت یاب ہو گئی۔

مگر آج کوڈو بھی اُسے چھوڑ کر چلا گیا۔ کاستو کو یوں معلوم ہونے لگا کہ آج اُس کی آخری رات ہے۔ اب اُس کی زندگی کا آخری موڑ آ گیا ہے۔ وہ زمین پر لیٹ گئی۔ اُس کے آنسوؤں کے باندھ آج پھر ٹوٹ گئے۔ کاستو ایک درد بھری آہ بھر کر سوچ رہی تھی۔ "ہاں میں نے

کیا سوچا تھا۔ ایک مہینہ پہلے اُسے پتہ چلا تھا کہ گھوڑ ری گاؤں میں کسی آدمی نے مادہ تیتریاں پال رکھی ہیں۔ گوڈو کے لئے ایک تیتری حاصل کرنے کیلئے اُس نے کسی سے سفارش بھی کروائی تھی اور پھر اُسے خیال آیا کہ اب گوڈو کیلئے ایک بڑے پنجرے کی ضرورت پڑ جائیگی" نظر بد دور۔ اب گوڈو اپنی گرہستی بسائے گا۔۔۔" اور کاشتو اِس طرح خوش ہونے لگی گویا سچ مچ ہی وہ کسی کی ساس بننے کی دادی بننے والی ہو۔ کاشتو نے آہستہ سے کروٹ بدلی۔ اُس کا جسم نڈھال اور بے سدھ ہو چکا تھا۔ سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی لیکن ہر سانس کے ساتھ گوڈو۔ گوڈو کی مدھم سی آواز آرہی تھی۔

اس حالت میں رات کا آخری پہر بیت گیا۔ اچانک کاشتو کے کانوں میں کوئی جانی پہچانی آواز آئی۔ وہ گہری بے ہوشی کی سمادھی سے نکل آئی اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی روشنی گپھا کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ کاشتو کو یوں محسوس ہوا کہ کوئی اُسے بلا رہا ہے وہ آہستہ آہستہ باہر نکلی۔ اخروٹ کے درخت پر گوڈو بیٹھا ہوا تھا۔ کاشتو دیکھ کر وہ ناچ اُٹھا اور اُسی کے گلے میں پڑا ہوا گھنگھرو بج اُٹھا۔ چھن۔ ٹن۔ چھن۔ ٹن

کاشتو کی آنکھوں سے پھر سے دو آنسو ٹپک پڑے اور اُس کے منہ سے نکلا:۔

گوڈو بیٹے۔۔۔!

سوگ سیڑھی

از
مدن سنگھ ٹھاکر

اِسی دن کے لئے ہی دادی اماں اپنے بڑھاپے کا بوجھ سنبھالے زندہ تھی۔ آج تک وہ جہنم کی سی کوفت برداشت کرتی آئی تھی۔ اتنی لمبی عمر کے رنج و الم سہتی چلی آرہی تھی۔ اُسکے ارمان بلکتے تھے کہ اِس زندگی میں سکھ چین نصیب نہیں ہوا تو کم از کم دوسری دنیا میں تو ملے۔ دھرم گرنتھوں سے اُسے یہ تسلی ملی تھی۔ کہ بڑا بیٹا وہ سیڑھی تھام سکتا ہے جو اُسے سیدھا

سورگ میں پہنچا دے گی۔ اسی لئے دادی اماں نے بڑے پوتے کا نام رکھنے کی نذر کا رسم سر انجام پاتے ہی سونے کی ایک چھوٹی سی سیڑھی اُس کے گلے میں لٹکا دی۔ وہ سیڑھی جس کے سہارے اُسے زمین کے نرک سے آسمان کے سورگ تک کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ آج وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ ہون کنڈ کی مقدس آگ کے قریب بیٹھی وہ اپنی عمر سے بہت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔ سب کی نظریں اُس کے سن رسیدہ چہرے پر لگی ہوئی تھیں جس کی جھریاں نہ جانے کتنے برسوں سے بیتے دکھوں پر مسکرا رہی تھیں۔ اُس کے ہونٹ فرطِ مسرت سے کانپ رہے تھے گویا وہ اُس کی بوڑھی بے سُری آواز کو نوجوان لڑکیوں کی پُرشور سریلی آواز میں تحلیل کرنا چاہتے ہوں۔ "رنمی کھیچے بنگوڑا نے مستھا کھیچے نگی ....." (ڈوری پالنے کو اور ننھا ننھے بچے کو کھینچ رہی ہے)۔ ننھا دادی اماں کی سورگ سیڑھی کو گلے میں لٹکائے سو رہا تھا۔ دادی اپنے پوتے پر نظریں جمائے گم سُم بیٹھی تھی گویا تصور میں سونے کی سیڑھی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ پاؤں دھرتے وہ جنت کی طرف بڑھتی ہی جا رہی تھی دھرتی کے اس نرک کو پیچھے چھوڑ کر جس میں جلتے ہوئے اُس نے اپنی عمر کے اسّی برسوں تک خون کے آنسو بہائے تھے۔ ایک کونے سے بوڑھی عورتوں نے "بٹھیالی"[۱] کی تان چھیڑی۔ ہون کنڈ کے شعلے خوشبودار دھوئیں کی طرف لپکے اور بھڑک اٹھے۔ اب ہر طرف بوڑھی آواز کا سنگیت تھا۔ پہاڑی لوک گیت کے بول تھے جو نہ جانے کتنی صدیوں سے اسی سُر اور لے میں گائے جا رہے تھے۔ صدیاں بوڑھی ہو گئیں لیکن گیت کے بول ابھی اسی طرح جوان تھے سنگیت اسی طرح جوان تھا۔ ایک ٹلی بیتی عمر کی یاد تازہ تھی۔

"جس دن میرا ہری ہر جنمیا ......" ہر عورت کو اپنے بیٹے، اپنے پوتے یاد آئے۔ اور وہ دن یاد آئے جب وہ ماں بنی تھی۔ دادی بنی تھی۔ بوڑھی، تھکی تھکی سی آواز کا سنگیت پُر جوش تھا۔ بڑھاپا عمر کی تھکن اور افسردگی سے بے نیاز گا رہا تھا۔ دادی کی کانپتی ہوئی آواز بھی اسی میں شامل تھی وہ شاید اپنی ہی آواز کا تعاقب کرتی رفتہ رفتہ ماضی کی بھولی بسری یادوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ اس سیڑھی کو بھول گئی تھی۔ جو دوسری دنیا کی جنت کو چھوتی ہے۔ اُس نے اُس سیڑھی کو اپنا لیا تھا جو دنیا کی جہنم

۱۔ بچے کی پیدائش پر گائے جانے والے لوک گیت۔

کو نایاب رہی تھی جسے اپنانے کیلئے وہ آج تک زیادہ رہنے کی جستجو کر رہی تھی۔ آواز میں آواز ملانے دادی ماں کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ جیسے بے نور آنکھوں میں ماضی کے دھندلے نقوش جھلملانے لگے ہوں مری مٹی آوازیں بکھرنے لگی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

"پدمنی! اس بیمار زندگی کا کیا بھروسہ! بہتر بیٹے کی اچھی طرح پرورش کرنا ہم دونوں کا یہی آتا فرض ہے"۔ خاوند کی آواز تھی جو جوانی میں ہی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی۔ دادی اماں کی آواز بند ہو گئی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے گیت کے بھنوروں میں بکھر گئی ۔ ۔ ۔

اب اُس کی نگاہوں کے سامنے اپنے شوہر کا جنازہ تھا۔ جوان بیوہ کی گود میں ایک معصوم بچہ تھا اور زندگی کا سفر کتنا طویل۔ کتنا کٹھن۔ کتنا اکیلا تھا۔ دادی اماں نے مرحوم شوہر کی نشانی کو بنائے رکھنے کیلئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ اپنے سارے سکھ قربان کر دیئے۔ بیٹے کو پالا۔ پڑھایا اور ٹھاٹھ سے اس کا بیاہ رچایا۔ لیکن ایک دن بیٹا بھی خاوند کی طرح جوانی میں ہی ساتھ چھوڑ گیا۔ اب وہ تھی جوان بیوہ بہو تھی اور گود میں دو برس کا بچہ تھا جنہیں مرنا چاہیئے تھا۔ اُن کی زندگی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اب بھی دیکھ رہی تھی اور جنہیں جینا چاہیئے تھا اُن کی زندگی آنکھیں موند کر ہمیشہ کیلئے سو گئی تھی۔ بوڑھی عورتیں گا رہی تھیں دادی ماں کے سامنے زندگی کی کتاب کے ورق سرسرا رہے تھے۔ پتی کی موت! بیٹے کی موت!! اور پھر ایک دن جوان بہو کی موت!!!۔ اور صرف ایک خالی گود۔ جس میں پہلے اپنے بیٹے کو سنبھالے رکھا اور ایک دن اپنے پوتے کو۔ اور اب نہ جانے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دادی نے اپنی گود کو دیکھا۔ وہ خالی تھی۔ وہ اب اُسے خالی ہی رکھنا چاہتی تھی۔

شاید اسی لئے اُس نے آج تک اپنے پڑپوتے کو گود میں نہ لیا تھا شاید اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ اُس کی گود ہی منحوس ہے۔ دادی ماں کو یوں دکھائی دیا کہ اُس کے سامنے سے تین جنازے گزر رہے ہیں۔ ایک خالی گود اُس کی آنکھوں کے سامنے تن گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی ماضی کے نقوش بھیانک اور ڈراؤنے تھے۔ وہ بہو کی طرف لپکی جو لفافوں میں بتاشے ڈال رہی تھی۔ اپنا جھریوں والا چہرہ سکیڑ کر دادی اماں نے کہا "کئی بار کہا ہے کہ آرام سے لیٹی رہا کرو۔ کمزوری اور بیماری کی حالت میں زیادہ ہلنا جلنا ٹھیک نہیں ہوتا

جاکر آرام کرو۔ میں خود کام کر لیتی ہوں"۔ بہو کے لئے یہ نئی بات تھی۔ کل تک یہی دادی ماں اُسے ہزار ہزار صلواتیں سنایا کرتی تھی لیکن آج اور کل میں کتنا فرق تھا۔ آج تو دادی ماں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ آج وہ بڑھی بھی نہ دکھائی دیتی تھی۔ آج عمر بھر کی تکان۔ عمر بھر کا دکھ ختم ہو چکا تھا۔ بہو اُس کا پیار بھرا تاثر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ دادی ماں نے پوچھا "خاموش کھڑی کیا دیکھ رہی ہو؟" بہو سر جھکا کر اپنے کمرے میں جانے لگی تو دادی ماں نے روک لیا۔ دیر تک اُس کے معصوم چہرے کو دیکھتی رہی۔ پھر اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہنے لگی "تمہارا نام لے لے کر در اصل میں اپنے آپ کو ہی کوستی رہی ہوں تم تو گھر کی لکشمی ہو۔ تم نہ ہوتیں تو میرا پڑپوتا کہاں سے مجھے ملتا؟ کس کے گلے میں باہیں سورگ سیڑھی ڈالتی۔ کس کے سہارے سورگ میں جاتی؟ تم نے میرا جیون سپھل بنا دیا ہے۔ بہو۔ خوب ہنسا کرو، مسکرایا کرو۔ یہی عمر ہے ہنسنے مسکرانے کی" پھر خود ہی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور لفافوں میں بتاشے ڈالنے لگی۔

دادی اماں۔ ایک خاندانی عورت تھی۔ جو میکے والوں سے کافی دولت لائی تھی لیکن تھی بدنصیب۔ جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی۔ اکلوتا بیٹا تھا۔ جسے خاندان کی زندگی اور مستقبل سمجھ کر پالا۔ پوسا۔ لیکن ایک دن وہ بھی روٹھ کر ہمیشہ کیلئے چلا گیا۔ اس کے بعد بہو بھی چل بسی۔ اور جاتے جاتے پانچ سال کا بچہ چھوڑ گئی۔ یہ سارا دکھ کتنا جان لیوا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ یہ پوتا ہی ایک دن خاندان کی بیل کو سرسبز کریگا۔ اِسے اپنے بیٹے سے بھی زیادہ لاڈ پیار سے پالا پوسا۔ لیکن بڑھاپے کا اندھا پیار۔ ہوش سنبھالتے ہی وہ آوارہ اور عیاش ہو گیا۔ تعلیم بھی پوری نہ کر سکا۔

زمین۔ جائیداد کے بل بوتے پر اُس کی شادی ٹھاٹھ باٹ سے ہوئی۔ سات سال تک بہو کی گود ہری نہ ہوئی تو دادی اماں کو خاندان کا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا۔ وہ سٹ پٹا گئی۔ گالیوں پر اتر آئی۔ ساری عمر روتے دھوتے گذری تھی۔ لیکن وہ عاقبت سدھارنے کی فکر میں تھی۔ ایسا جہنم سے چھٹکارا حاصل کر کے جنت میں جانا چاہتی تھی لیکن اس جنت

کی سیڑھی تو پڑپوتا ہی لگا سکتا تھا۔ ادھر پوتے کی آواز گئی اُدھر بہو کا بانجھ پن دادی اماں
کیلئے ایک کانٹا بن گیا جو ہر وقت اُسے چبھتا رہتا تھا۔ اسی غم میں گھل گھل کر آخر ایک دن
اُس نے چارپائی کا سہارا لے لیا۔ روگ لمبا تھا۔ بچاری زندگی اور موت کی لہروں میں تیرتی اور
ڈوبتی رہی۔ آخر ایک دن موت قریب آ گئی۔ ہاتھ بے جان ہو گئے۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ گھر میں رونا
دھونا شروع ہو گیا۔ روتے روتے دادی اماں کی کسی ہم عمر سہیلی نے اُس کے کان میں کہا۔ کہ
”گھر میں پڑپوتا آنے والا ہے اور تو جانے کی تیاری کر رہی ہے“۔ یہ سُنتے ہی دادی ماں کی آنکھوں
میں چمک آ گئی۔ ہونٹ آپ ہی آپ حرکت کرنے لگے۔ جیسے اب وہ جینے کیلئے دعا مانگ رہی ہو
اور پاس کے محلے والوں نے دیکھا کہ وہ چارپائی پر بیٹھی مست ہو کر اپنا پیارا بھجن گا رہی ہے
”میرے ہری بھان۔ پھیر یا رام بھان۔ دن نکلے تے راتاں بڑیاں ...“۔ اور پھر ایک دن
وہ کھڑی ہو کر آہستہ آہستہ صحن میں گھومنے لگی۔ اس قدر شدید اور لمبی بیماری کے بعد اُس کی ہمت
دیکھ کر لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز ”آنے والے“ کیلئے چھوٹی
چھوٹی چیزیں بناتی، سجاتی، سنوارتی رہتی اور بھجن گاتی رہتی۔ دادی اماں ہنستی قہقہے لگاتی
اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ نہ جانے گیتوں کی تانیں کب ٹوٹیں۔ بینڈ باجے والے کب گئے۔ شام
ڈھل چکی تھی۔ پڑوسی اور رشتہ دار عورتیں کھا کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ کون کب
آیا، کب گیا۔ دادی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ اُس کے سامنے ایک لمبی عمر کی کہانی تھی وہ اُسی میں
دن بھر الجھی رہی۔ بہت رات گئے وہ چارپائی پر لیٹی۔ دن کا ہنگامہ ختم ہو چکا تھا۔ سب
کھا پی کر سو چکے تھے۔ پوجا گھر کے سامنے اُس کا پوتا پورن سویا ہوا تھا۔ اور سوتے میں بڑبڑا
رہا تھا۔ ایک طرف بہو ننھے کو سینے سے لگائے لیٹی ہوئی تھی۔ دادی اماں پورن کے بارے میں
سوچنے لگی۔ اپنے من ہی من باتیں کرنے لگی۔ کیا پورن کبھی انسان بنے گا؟ ٹھیک راستے پر
آئیگا؟ کیا وہ اپنے خاندان کی کچھ ذمہ داری سمجھے گا۔ جس کی ہمیشہ ایک شاخ ہی ہری ہوتی
رہی ہے۔ وہ شاخ جس کو میں نے آج تک گرمی سردی سے بچائے رکھا۔ کیا وہ شاخ اب دوسری
چھوٹی شاخوں کو جنم دے گی؟ کیا وہ خود سلامت رہ سکے گی؟ کیا پورن ...؟ ایسی ہی
من باتیں کرتے کرتے دادی ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے دور سے ہی ننھے کو دیکھا

جس کے گلے میں پڑی سونے کی سیڑھی مدھم مدھم روشنی میں جھلملا رہی تھی۔ اُسے پنڈت جی کی باتیں یاد آ گئیں۔ بچے کی عمر لمبی۔ رُتبہ اعلیٰ۔ خاندان اور جائیداد کی ترقی۔ والد کو راہِ راست پر لائیگا اور خاندان کا نام روشن کریگا ۔ ۔ ۔ پنڈت جی کی پیشن گوئی یاد کر کے اُس نے آنسو پونچھ ڈالے۔ اب اُس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ فرطِ مسرت سے اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔

چارپائی پر سے اٹھ کر وہ پوران کے پاس دیر تک بیٹھی رہی۔ اُسے دیکھتی رہی ایک دو بار اُس کی پیشانی چومنے کو جھکی بھی۔ پھر وہ بہو کی چارپائی کے پاس گئی اُس کے ایک ایک زیور کو چھُوا۔ اُس کا ہاتھ اٹھایا اور اپنی خالی گود سے لگا کر ننھے کو دیکھا۔ وہ اُسے گود میں اٹھا کر چومنا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کیوں جھجک گئی۔ اپنے کانپتے ہاتھوں سے اُس نے سونے کی سیڑھی کو چھُوا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ اور پھر پوجا گھر میں جاکر بیٹھ گئی۔

آج کا دن دادی اماں کے ارمان پورے ہونے کا دن تھا۔ آج کی رات وہ بھی وہ اپنا بنانا چاہتی تھی بھگوان کی مورتی کے سامنے بیٹھ کر وہ اپنا پیارا بھجن گنگنانے لگی:۔ "میرے ہری بنال، تیرے رام بنال ۔ ۔ ۔ ۔" گاتے گاتے اُس نے آنکھیں موند لیں۔ اب اُس کے سامنے بھگوان کی نہیں بلکہ ننھے کی ہی مورت تھی جس نے اپنے ننھے نازک ہاتھوں سے سونے کی سیڑھی تھام رکھی تھی۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں آہستہ آہستہ سیڑھی پر چڑھنے لگی۔ اُسے محسوس ہوا گویا وہ چڑھتے چڑھتے تھک گئی ہے۔ اُس کا جسم کانپنے لگا ہے سانس تیز ہو گئی ہے اور جیسے وہ تھک ہار کر اُسی سیڑھی پر سستانے بیٹھ گئی ہے ۔ ۔ ۔

صبح سویرے دادی ماں کے ارد گرد اپنے پرائے سب جمع تھے ہر کسی کی آنکھوں میں آنسو تھے صرف ننھا مسکرا رہا تھا جیسے اُس نے دادی اماں کی ایک دیرینہ آرزو پوری کر دی ہو اور اپنے خاندان کے سر سے برسوں کا مقدس قرض اُتار دیا ہو۔

اندھیرا اور سویرا

از
مرحوم ڈی۔ آر۔
سوہن کار

بدری چوکیدار نے جس وقت دفتر بند کیا تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ بڑا صاحب گھر سے دو بجے آتے تھے اور پھر چھ بجے تک بیٹھے رہتے تھے۔ منہ میں گالیاں بکتے جھکتے ماتحتوں کو بھی بس مار کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ بدری نے ایک ایک تالے کو ہلا ہلا کر تسلی کر لی کہ وہ اچھی طرح سے بند ہے۔ وہ بڑا پھاٹک بند کر ہی رہا تھا کہ سامنے سے آتے ہوئے دفتر کے خزانچی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا "بدری رک جانا"۔ خزانچی کے پیچھے پیچھے تین آدمی اور آ رہے تھے۔ دفتر کا ہیڈ کلرک۔ اکاؤنٹنٹ اور ٹھیکیدار۔ ان لوگوں کا اس بے وقت آنا بدری کو بہت برا لگا۔ اب آدھی رات تک اسے ان لوگوں کی اردلی دینی پڑے گی۔ پھر بھی سرکاری پابندی کی وجہ سے چوکیدار کو آداب عرض کرنا پڑا۔ "بدری پچھلا کمرہ کھول دو"۔ یہ پچھلا کمرہ یوں تو دفتر کا سٹور تھا لیکن عام طور پر "جشن" منانے کے کام میں لایا جاتا تھا۔

بدری نے کمرہ کھول دیا۔ ٹھیکیدار نے اپنے بٹوے میں سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور بدری کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لو۔ دو بوتل سوڈا۔ چار پیکٹ اصلی گولڈ فلیک اور دو تندوری مرغے"۔ مرغوں کا نام سنتے ہی اکاؤنٹنٹ کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے اپنے بازو اس طرح پھڑپھڑائے گویا تندوری مرغا ہی بانگ دینے لگا ہو۔

"ٹھیکیدار بہاری لال۔ زندہ باد"۔ ہیڈ کلرک نے نعرہ بلند کیا۔ "بہاری لال! تم نے ناسک پریس کے ایک نوٹ سے ہی ہم سب کو کچھ ڈالا ہے۔ اور اپنے اس باپ کو؟ سچ بتانا۔ کیا دیا ہے؟"۔ خزانچی نے پوچھا۔ "بڑا صاحب! تمہاری قسم۔ وہ آدمی نہیں دیوتا ہے۔ دیوتا! روپیوں کی بات ہی چھوڑو۔ وہ جان مانگے تو حاضر ہے"۔

"پھر بھی کتنی پرسینٹ (20) یا پچیس (۲۵)؟"

"پچیس ۲۵" - ٹھیکیدار نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "بابو جی کیسی باتیں کرتے ہو؟ - ذرا حساب تو لگاؤ کہ آپ تینوں کے حصہ میں کیا آتا ہے؟ پھر - اوورسیر، اسسٹنٹ اور دوسرے چھوٹے بڑے اہلکار۔ بڑے صاحب کی ڈیمانڈ تو پچیس پرسینٹ کی ہی تھی لیکن میں نے پندرہ پرسینٹ ہی دیئے"۔ بدری چوکیدار کو واپس آتے دیکھ کر وہ خاموش ہو گیا "کیوں کیا بات ہے؟" - "بات کیا ہونی ہے جی۔ مجھے برآمدے میں کچھ نوٹ پڑے ملے ہیں"۔ بدری نے نوٹ اپنی مٹھی میں بند رکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ آپ کے تو نہیں؟" - چاروں سفید پوش اپنی اپنی جیبیں ٹٹولنے لگے۔ "میری جیب میں کچھ روپے کم معلوم ہوتے ہیں۔ تمہیں کتنے ملے ہیں؟" اکاؤنٹنٹ بول اٹھا۔

"بابو جی۔ پہلے آپ ہی بتائیں کہ آپ کے کتنے کم ہیں؟" - اکاؤنٹنٹ نے اپنے نوٹ گنے "دس دس والے تین نوٹ کم معلوم ہوتے ہیں"۔ بدری نے سر ہلایا "نہیں جی۔ پھر آپ کے نہیں ہیں"۔ تُک لگانے کی یہ بیوقوفی باقی تینوں نے نہیں کی۔ ٹھیکیدار نے کہا۔ "نہیں بھائی۔ ہم میں سے کسی کے بھی نہیں ہیں۔ یہ تم ہی رکھ لو سمجھ لو۔ دیوالی کا جلسہ پرماتما نے پہلے ہی کرا دیا"۔ - "نہیں مالک۔ یہ جلسہ مجھے نہیں درکار۔ کل دفتر والوں میں سے دریافت کروں گا۔ نہ ہوا تو گائیوں کو گھاس کھلا دوں گا"۔ بدری کی یہ بات سن کر ٹھیکیدار نے خفت چھپانے کیلئے اپنی دیانتداری کا ایک واقعہ (شاید اسی وقت تراش کر) سنایا کہ کس طرح اُسے ایک بہت بڑی رقم اسی طرح ملی تھی۔ جسے اُس نے اصل مالک تک پہنچا دیا تھا۔ اس کے بعد کلیاں کھلنے لگیں۔ باقی تین کیسے پیچھے رہنے والے تھے۔ ہر ایک نے اپنی دیانتداری کی (من گھڑت) کہانیاں سُنا دیں

چوکیدار نے تمام سودا خرید کر اُن کے سامنے لا رکھا اور خود رگھوناتھ جی کے مندر چلا گیا۔ جموں نوکری کرتے ہوئے اُسے بیس ۲۰ سال ہو گئے تھے اور اتنی ہی مدت ہو گئی تھی اُسے ہر شام مندر جاتے ہوئے۔ مندر سے آ کر اُس نے سٹور کے بند دروازے پر کان لگا کر سُنا اندر جوا کھیلا جا رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں وہاں سے واپس آ گیا۔ باہر برآمدے میں اُس نے

چارپائی پر بستر بچھایا۔ کپڑے کھول کر سرہانے رکھے اور لیٹ گیا۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد رات کو بدری کے خیالات اُڑ کر گاؤں میں اُس کے گھر تک جا پہنچے تھے۔ اُس کے تصور کی آنکھیں گھر کے اندر باہر گھومنے لگیں۔ بدری سوچنے لگا کاش صاحب کے کمرے والا ٹیلیفون گاؤں میں اُس کے گھر بھی لگا ہوتا تو پربھو اندر اُس کی والدہ روز اُس سے باتیں کرتے۔ ٹیلیفون نہ سہی۔ اب ایشور کی مہربانی ہے پربھو خط لکھنے کے قابل ہو گیا ہے۔ شکر ہے گھر کی خیر و عافیت تو مل ہی جاتی ہے۔۔" خیالات کے تار ملے۔ بدری کو پربھو کی اُس چٹھی کی یاد آگئی جو اُسے پرسوں ملی تھی۔ چٹھی میں پربھو نے اپنے والد کو دیوالی پر گھر آتے ہوئے اُس کے لئے بوٹ اور سکول کی وردی لانے کی تاکید کی تھی۔ بدری کی آنکھوں میں پیار کے آنسو آگئے۔ زندگی میں پہلی بار اُس کے لختِ جگر نے کسی چیز کی فرمائش کی تھی۔ غریب باپ کا بیٹا گھر کی غربت کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ بدری انگلیوں کی پوریں گن گن کر حساب کرنے لگا۔ اس بار پیٹ کاٹ کر اُس نے بیس روپے جمع کئے تھے۔ مٹھائی اور بچے کیلئے وردی۔ بوٹ قیمتی نہیں تو فلیٹ ہی سہی۔۔۔۔ صبح بدری بیدار ہوا اور قمیض پہننے لگا تو اُسے معلوم ہوا کہ رات والے نوٹ اُس کی جیب سے غائب ہیں۔ جیب خالی تھی۔ اُس کی چارپائی کے پاس کریپ سول والے بوٹ کے نشان چور کا سُراغ بتا رہے تھے۔

بیچارا چوکیدار گہری سوچ اور پریشانی کے عالم میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ برآمدے کی دوسری طرف جمالو خاکروب اُس سے بھی زیادہ پریشانی کے عالم میں کھڑی تھی۔

"کیوں جمالو کیا بات ہے؟" - "بات کیا ہونی ہے۔ میں تو اُجڑ گئی چوکیدار جی"
"کچھ کہو تو سہی کیا ہوا؟" - "کل شام کو تنخواہ لیکر میں نے دوپٹے کے پلّو میں باندھی تھی۔ دفتر میں صفائی کر کے گھر پہنچی تو پلّو کھلا تھا۔ میں نے سوچا دفتر میں ہی گر گئے ہونگے۔ رات کو کیسے لے جاتے ہیں۔۔۔" - بدری نے پوچھا "کتنے روپے تھے؟" جمالو نے روتے روتے جواب دیا "دو۔ دو والے نو نوٹ تھے چوکیدار جی بڑا لڑکا کتنے دنوں سے سکول کی وردی کیلئے چلّا رہا تھا۔ سوچا تھا کہ اس تنخواہ سے۔۔"

"فرطِ غم سے جمالو کا گلا رُک گیا۔ جھاڑو ایک طرف رکھ کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔

بدری چوکیدار کو یوں محسوس ہوا کہ جمالو نے اُس کے کلیجے پر اپنی انگلیاں رکھ دی ہیں۔ بڑا جبر کر کے اُس نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔

"سمجھدار بنی! اپنا منہ ہلکا کر تیرے روپے مجھے مل گئے ہیں!" جمالو کے رُکے ہوئے آنسو اب خوشی کے مارے پھر نکل آئے۔ اُس نے کہا۔ "سچ چوکیدار جی؟"

باوری۔ اپنے کوارٹر میں جا کر وہ پوٹلی لے آیا جس میں اُس نے اپنے بیٹے کی وردی کیلئے روپے باندھ رکھے تھے۔ روپوں کے ساتھ ہی وہ خط بھی تھا۔ جس میں بیٹے نے وردی کے لئے لکھا تھا۔ اٹھارہ روپے جمالو کے ہاتھ پر رکھ کر بدری نے وہ خط پھاڑ ڈالا۔ اُسے یوں محسوس ہوا کہ خط نہیں بلکہ وہ اپنے بیٹے کی وردی پھاڑ رہا ہے۔ پھٹے ہوئے خط کے پرزے اُڑ اُڑ کر جمالو کی طرف جانے لگے۔

ختم شد